مصطفیٰ زیدی کی کہانی

مرزا حامد بیگ

مصطفٰے زیدی کی کہانی

مرزا حامد بیگ

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز

۲۵۔ لوئر مال، لاہور

ناشر : طاہر اسلم گورا

۱۹۹۳ء

اشاعت اول

قیمت ۱۱۰ روپے

تعداد ایک ہزار

سرورق مرزا حامد بیگ

مصطفےٰ زیدی کے کلام کے انتخاب کی خصوصی اجازت کے باب میں مصنف، ارتضیٰ زیدی صاحب کا شکر گزار ہے۔

سجاد باقر رضوی

اور

مشفق خواجہ

کے

نام

☆

مزامیر

○

○

اب میرے قاتل کو چاہو

مصطفےٰ زیدی کی ذات کا افسانہ عجب فسانہ ہے کہ اسکی بابت عینی شہادتیں بھی مشکوک ہیں۔ وہ مجموعۂ اضداد تھا' اب کون دعوےٰ کرے کہ اسے یکجا دیکھا۔

اس نے اپنے حصے بخرے کر کے ادھر ادھر بکھیر چھوڑے تھے۔ ہر حصہ ایک معمہ' اصل کی خبر کون لائے۔

رواروی میں دیکھنے والوں کو اس نے صاف بچھ دیا۔ اب جس نے جو پہلو دیکھا' وہی اسکی پہچان ٹھہرائی۔ اس نے بھی اسی میں لطف لیا اور بات بڑھا کر اپنا وہی رخ دیکھنے والے کے منہ پر مارا۔

افسرین کر وہ اپنی مقبولیت پر دیگر افسران کی آنکھوں میں رشک اور حسد کا رنگ دیکھا کیا۔ ٹھیک یا غلط' چند من گھڑت اصولوں پر سختی سے کاربند رہا۔ وہ سب جانتا تھا۔ ہیرا پھیری کرنے والوں کے لیے صرف ایک جملہ: "اپنے باپ کو مت سکھاؤ کہ عورت سے کیسے ملا جاتا ہے"۔

اسکے اصولوں کی ایک شق بہت عجیب تھی ——— "فنکار کی ہر خواہش جائز ہے"۔

اس نے بہت سے ناجائز کو جائز بنایا لیکن اس کا معیار ———

"پشاور میں خیر سے شعراء کی بڑی معقول تعداد ہے۔ ایک تو ہوئے خاطر غزنوی پھر فارغ' رضا' خاطر' فراز وغیرہ اور پھر بقول حسن عسکری اردو کے پروفیسر نذیر مرزا برلاس' طاہر فاروقی وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ مشاعرے بھی ہوا کرتے ہیں۔ قسمت کا اچھا ہوں کہ اب تک کسی ادبی محفل میں شریک نہیں ہوا۔ انجمن ترقی اردو کے جلسے میں جانے کی البتہ خواہش تھی' سو تمہارے کالج نے بلایا نہیں"۔(۱)

اس بات کو محض معاصرانہ چشمک اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تو اپنے بڑے بھائی بھتیجے کے بھی گلے پڑ جاتا ہے' جب انہوں نے چوری سے اس کی نظم اور مضمون

یونیورسٹی میگزین میں اپنے نام سے چھپوا دیا تھا۔ وہ خوش اس لئے نہیں ہوا کہ بھتیجے کا ادب سے بس واجبی سا تعلق تھا اور اتنے بڑے اعزاز کے وہ اہل نہ تھے۔

ملازمت سے برطرفی کے موقع پر اسے جو چارج شیٹ دی گئی' اس میں اس کی نفاست طبع کا ذکر یوں ہوا ہے کہ بہان کا رہن سہن' اکی تنخواہ سے بہت بلند تھا۔ اسے کے خبر تھی کہ یہ معیار تو مصنوعی بھی نہیں تھا بلکہ مستعار تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم کے صوفے مصطفےٰ زیدی کے بھتیجے قیصر رضا کے تھے اور قالین ان کے دوست محمد فاروق خان کے۔ انہوں نے اپنے اوپر عائد کردہ الزامات کا جواب درآمد شدہ بہترین کاغذ پر درآمد شدہ فائل کور میں ہی دیا۔ جو خاص طور پر اسی مقصد کے لئے اس نے کسی دوست کی معرفت بیرون ملک سے منگوائے تھے۔ (۲)

اس کے جاننے والے ہر طرح کے تھے۔ ادیب شاعر' کھلاڑی' فوٹوگرافر' سب اس کے شناسا تھے۔ یہ سب کے سب بزعم خود اس کے گلے کا ہار تھے۔ لیکن وہ تھا بڑا چالاک' اس نے دوستوں کا ایک انوکھا اکاؤنٹ کھول رکھا تھا' جو ہر لمحے گھٹتا بڑھتا رہتا۔ جو شخص جتنی اہمیت کا حامل ہوتا اس کا اتنا حصہ' نہ کم نہ زیادہ۔

پھر کسی چیک بک میں وہ خانہ اس نے نہیں بنایا تھا جس سے کہ اپنے اکاؤنٹ کا حساب دیکھا جا سکے۔ کوئی کسی وقت بھی قلاش ہو سکتا تھا۔

دوستی اور خلوص کے معنی اکی نظر میں ایک تھے۔ اس لئے دوستوں سے اس نے توقعات بھی رکھیں' جس آسانی سے دوست بناتا اسی آسانی اور سرعت سے دشمنوں اور مخالفوں کی تعداد میں بھی اضافہ کرتا جاتا۔

منصور اظہر فاروقی کے مطابق جب مصطفےٰ زیدی لاہور کا ڈپٹی کمشنر تھا تو اس نے چودھری ظہور الٰہی کے آٹے کی مل' ناردرن فلور ملز' بند کروا دی۔ ظہور الٰہی نے گورنر تک رسائی حاصل کر لی لیکن مل کو نہ کھلوایا جا سکا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں مصطفےٰ زیدی نے اپنے دوست منصور اظہر فاروقی کی اس درخواست پر کہ آئندہ کوئی بے قاعدگی نہیں ہوگی اپنے احکامات واپس لے لئے۔ (۳)

۱۹۶۷ء میں جب مصطفےٰ زیدی کے چھٹے شعری مجموعے "قبائے ساز" کے مقابلے میں ادا جعفری کے مجموعے "شہر درد" کو آدم جی ادبی انعام ملا تو مصطفےٰ زیدی نے فیض، ندیم اور وقار عظیم جیسے، بزرگ مصنفین کو کھانے پر اپنے گھر بلایا اور ادا جعفری سے متعلق ہجو اشعار پر مشتمل ہجویہ نظم سنا کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر لیا۔

دوستی اور دشمنی کے درمیان وہ خود ایک حد فاصل تھا۔ تیز دو دھاری خنجر کے مانند۔

وہ ایک علم جو اٹھایا بنام صدق و وفا
نثار ہو گئے بازو مگر جدا نہ کیا

اسکی دوستی ایسی دوستی تھی۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس آزاد منش کو "ہلاک" کر دیا گیا۔ یہ خبر ہم لوگوں تک ایک نظم کے ذریعے پہنچی، مصطفےٰ زیدی تنگ آچکا تھا۔ اس نے کہا کہ مقتول تیغ الہ آبادی زندگی کے بدلے ہوئے تقاضوں کی راہ میں پتھر تھا۔

مرا حریف مرا مدتوں کا ساتھی تھا
وہ شخص جس کو ابھی قتل کر دیا میں نے
وہ زخم کھا کے بھی یوں دیکھتا رہا مجھ کو
کہ میرے وار میں بھی طرز دوستاں ہو گا
یہی گمان رہا اس کو نوک خنجر پہ
اگر یہ کھیل نہیں ہے تو امتحاں ہو گا
کچھ اور اس کو اگر مہلت نفس ملتی
تو ایک روز مرا اعتبار بھی جاتا

مرتے وقت وہ آزاد منش شاعر اپنی بچی کھچی ذات میں ایک یادگار چھوڑ گیا۔ وہ تھی

سچائی اور دوستی پر اندھا اعتقاد' جو آخرکار سراسر گھاٹے کا سودا بنا۔ ایک نام کے دوست نے ساہیوال بنک میں غبن کیا ------ اور ۳۰۳ بدعنوان افسروں کی فہرست میں آتے وقت وہی غبن کا الزام سی ایس پی مصطفےٰ زیدی کی پہچان بنا۔ کراچی کا ایک دوست ساہیوال میں اس کے ایماء پر بہت سی زمین لے کر صاف کر گیا ------ اور وہ بس مونہہ دیکھتا رہ گیا۔

وہ لاہور کا ڈپٹی کمشنر ------ سیکرٹری' ۳۰۳ میں آنے سے پہلے اور بعد میں مال روڈ کے جس سجے سجائے دفتر میں اپنے تمام ارسٹوکریٹ دوستوں کے ساتھ کافی پیتا اور گپ لگاتا تھا' ملازمت سے برخواست ہو کر دوستوں کے تیور دیکھتے ہوئے ایک دن اس دفتر کی دیوار پر پنسل سے صرف ایک شعر لکھ پایا:

ہزار سانپ رہ زندگی میں ملتے ہیں
خدا کرے کہ کوئی زیر آستیں نہ ملے

انسان دوست اور باضمیر ہونے کا مطلب مشکلات کو خود دعوت دینا ہے۔ آؤ حملہ آور کیوں نہیں ہوتیں۔ ایک رومن قول ہے کہ اس سے بڑھ کر نیک کردار کوئی نہیں جو اپنی شہرت' مقبولیت اور ہردلعزیزی کو گنوانا گوارا کر لیتا ہے مگر اپنے ضمیر کا خون نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے اپنے ضمیر کا خون نہیں ہونے دیا۔ آنکھ کی شرم رہنے دی۔ اس لئے اسے اپنا خون کرنا پڑا۔

اس نے ہمیشہ افسر شاہی نظام کے لئے خود کو **Misfit** کہا۔ سول سروس اکیڈمی کے بارے لکھا: "حکومت جن لوگوں کو اس میں رکھنے کا فیصلہ کرتی تھی' ان کے لئے شرائط کا ایک لمبا چوڑا مسودہ تیار کیا گیا تھا اور اگر وہ انہیں تسلیم کر لیتے تھے تو ان کو پاگل خانے میں سال بھر رکھا جاتا تھا۔ مکھن' انڈے' مرغ' کھلائے جاتے تھے اور جب پل جاتے تھے تو انہیں پیار اور دھمکیوں کے اختیارات کے ساتھ عوام کے پاس بھیج دیا جاتا تھا"۔ (۴)

وہ دفتر اور کلب دونوں میں خود غرضی' منافقت جھوٹ اور تصنع کی کھوکھلی معاشرت سے کراہت محسوس کرتا اور اس گھٹن کو لمحاتی طور پر ہی سہی' ٹالنے کے لئے شاعری کرتا۔ اس کے لاشعور میں یونگ کرچین کالج الہ آباد کے اس بوڑھے برگد کی محفلوں کی یاد تازہ تھی' جسے GLORY OF CAMPUS کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

اسکی زندگی ایک کھلی کتاب تھی جس میں مختلف لالہ رُخوں سے معاشقوں کی داستانوں کے ساتھ اس کی وفا شعار بیوی اور بچوں کی ننھی منی خوشیوں سے لے کر گل ہلٹ کے استقبال اور کلب کی تمام رنگین اور واضح تصاویر ملی ہیں۔

سیکڑوں جسموں سے کھیلی ہے جوانی میری

اس نے آندرے ژید کی آواز میں آواز ملائی۔

"نیک جذبات سے گھٹیا ادب تخلیق ہوتا ہے"

شیلے کی موت پر ایک جملہ بار بار سننے میں آیا تھا انہی الفاظ کی گونج مصطفےٰ زیدی کی موت پر سنائی دیتی ہے۔ "کسی فنکار کی زندگی پر کسی قسم کا اخلاقی حکم لگانا مناسب نہیں"

فلابیر اور فراق گورکھپوری کا جائزہ لیتے وقت ہم صرف ان کی فنکارانہ شخصیت اور نجی حیثیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ایک خاص طرح کا لائسنس ہے۔ جس کے تحت ہمیں صرف فنکار کے کام پر نظر رکھنی ہے' شخصی کمزوریوں پر نہیں۔ میں آپ سے یہی چھوٹ اس جواں مرگ شاعر کے لئے چاہوں گا۔ کیا یہ بڑی بات نہیں کہ موت کے بعد بھی لوگ اسے کھرا شاعر اور پڑھا لکھا آدمی کہتے ہیں؟

کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ فنکار کی شخصیت اسکی تخلیقات میں جھلکتی ہے۔ بہت حد تک ایسا ہے بھی لیکن میرے نزدیک فنکار تک مکمل رسائی اس کی سوانح' ڈائریوں' خطوط اور نجی محفلوں میں گفتگو اور مختلف مسائل پر خیالات کے اظہار کی چھان پھٹک سے ہی ہو سکتی ہے۔ تخلیقات میں اس کے بالکل الٹ بھی ملنے کا امکان ہے۔ ایلیٹ کی مثال ہمارے سامنے ہے جو کٹر قسم کا قدامت پسند اور شاہ پرست تھا لیکن اس کی

تحریروں میں اس بات کا شائبہ تک نہیں ملتا اور پھر اپنے ریاض خیر آبادی ـــــــــ

مصطفےٰ زیدی کو زندگی سے پیار تھا۔ اس میں زندگی سے نفرت کرنے کا حوصلہ بھی تھا۔ جو پیار ہی نہ کر سکے نفرت کیا کرے گا۔

۱۹۵۳ء میں احمد علی سید کو ایک مختصر خط لکھا:

"I HAVE AN ILLUSION SAROJ AND DIS-ILLUSION MANKIND INCLUDING SAROJ"

یہ اسکی روداد حیات کا علامتی بیان ہے۔ دوستو فسکی نے مشورہ دیا ہے کہ ہمیں زندگی سے محبت کرنی چاہیئے' زندگی کے معانی سے نہیں۔ مصطفےٰ زیدی کی شاعری ہمیں اس مقام تک لے جاتی ہے جہاں زندگی سے محبت' معانی کی جستجو بن گئی ہے۔ یہ شاعری کائنات کی آگہی میں شرکت چاہتی ہے۔

مصطفےٰ زیدی ایک بچہ تھا۔ ہر وہ چیز جس سے وہ جذباتی وابستگی محسوس کرتا اس کے لئے قریب نظر بن جاتی۔ وہ زندگی کے اس پہلو میں اس بات کا قائل تھا:

"BEAUTY IS TO TOUCH AND POSSES NOT TO LOOK AT."

اسے جو چیز مل جاتی اسے پسندیدہ کھلونے کی طرح محبت کی شدت سے بھینچ کر توڑ دیتا اور جو دسترس سے باہر ہوتی اس کی طرف بار بار ہاتھ بڑھاتا۔ بالکل ننھے بچے کی مانند جو ہمک کر چندرما کو اپنی مٹھی میں لے لینا چاہتا ہو۔ ناکامی کی صورت میں "دوراہہ" اور "زخمی تصور" جیسی نظمیں لکھی جاتیں۔

"زندگی بے معنی ہے' بنیادی طور پر بے مقصد (ے) ہم اپنے تجربے ریاضت اور اپنی آگہی سے زندگی کو قبائے معنی پہناتے ہیں"۔ یہ سب باتیں سوچتے ہوئے "کرب اسٹریٹ کی کہانی" لکھتا۔

فی زمانہ مذہبی نظریات سے اسے ہمیشہ وحشت رہی۔ مذہب کے معاملے میں اپنے استاد جوش ملیح آبادی کا پیروکار تھا۔

زندگی کرنے کا یہ رویہ اس وقت کے غلام ہندوستان کے ہر باشعور رومانی فرد کا

رویہ ہے' جو ہر چیز سے بغاوت کرتا ہے۔ سیاست اور ادب کے باغی رجحانات اسے وقت کی مروجہ مذہبی پابندیوں سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

اس کی مذہب سے بیگانگی' انوکھی وضع قطع اور بے ترتیب لباس سے ہمیشہ اس کے جاننے والوں اور گھر والوں کو الجھن رہی۔ وہ اپنی روایات اور مروجہ اقدار کا باغی تھا' جس کی ابتداء اس نے اپنے گھر سے کی۔ وہ کسی دوسری طاقت کے ماتحت کام نہیں سکتا تھا۔ ہمیشہ من مانی کرتا اور حلقہ احباب میں نمایاں جگہ کا متقاضی رہتا۔ ابن صفی بتاتے ہیں: "میری ان سے آخری ملاقات ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی۔ دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک آدھمکا۔ اس کے ساتھ اس کے کسی دوست کا بچہ بھی تھا۔ بچے سے اس نے کہا۔ "لو دیکھ لو یہ ہیں ابنِ صفی ------ بڑے آئے ابنِ صفی' ابنِ صفی نہیں' ابنِ مصطفےٰ زیدی ہیں"۔

پھر میری گردن میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا تھا اور بچے سے بولا تھا:

"وہ سامنے الماری ہے۔ جتنی کتابیں نہ پڑھی ہوں نکال لو ------ بلکہ پوری الماری اٹھا کر لے جاؤ۔ بڑے آئے کہیں کے ابنِ صفی۔ "بچہ الماری پر پل پڑا تھا اور وہ مجھ سے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا" بڑا تاؤ آتا ہے تم پر' جب عورتوں سے تمہارا بہت زیادہ ذکر سنتا ہوں"۔ میں نے کہا "کہہ دیا کرو ------ بس ہونی سا ہے" (۵)

"اور نہیں تو کیا ڈان ژوان کہوں گا ------ تمہاری صورت پر اتنی تیمی برستی ہے کہ کوئی عورت آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا پسند نہ کرے گی"۔

۱۹۵۱ء کے اواخر کا زمانہ تھا۔ جب مجھلے بھائی نے الہ آباد سے پاکستان بلوا لیا۔ اس کے دوسرے تیسرے روز موصوف "نیا ادارہ" گئے۔ چودھری نذیر احمد کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ ایسے لوگ جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انہوں نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اب بات تو نہ ہوئی کہ ان سب کا منہ کھلے کا کھلا نہ رہ جائے۔ اس نے صرف چودھری صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا:

"تیغ الہ آبادی' ابھی ابھی بغیر پاسپورٹ کے چھپتا چھپاتا الہ آباد سے سیدھا آپ

ہی کے پاس آ رہا ہوں"۔ اس کے بعد وہ آرام دہ کرسی پر بیٹھا' ان سب بڑوں کو حیران بچوں کی طرح انگوٹھے چوستے دیکھ رہا تھا۔

وہ ہر الجھیڑے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتا۔ نتیجتاً" کئی بار قریبی دوستوں کے ساتھ تلخ کلامی تک کی نوبت آئی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں پہروں اپنے کئے پر پشیمان ہوا اور اگلی ملاقات پر خود کو گالیاں دیتے ہوئے روٹھے ہوئے مسعود اشعر اور سجاد باقر رضوی کو بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ کار چلاتے ہوئے اگر کوئی شخص سامنے آگیا تو بریک لگاتے ہی گالیوں کی بوچھاڑ کر دی لیکن فرلانگ بھر آگے جا کر واپس بھی لوٹا اور راہگیر کو اپنے ساتھ کار میں بٹھاتے ہوئے معافی مانگتا اسے گھر تک چھوڑ کر آیا۔

بعض لوگ اس کی ایسی باتوں کو افسرانہ جلال کا نام دیتے ہیں لیکن ایسے واقعات تو اس زمانے میں بہت زیادہ پیش آئے جب وہ صرف شاعر تیغ الہ آبادی تھا۔

اس نے محض اپنی انا کی خاطر تین بار موت کو للکارا۔ یہ للکار رومانی اعتماد کی شکست کا نتیجہ تھی۔ یہی پسند اور ناپسند کی شدت تھی کہ جن لڑکیوں سے اس نے اپنے ملک میں شادی کرنا چاہی ان کی اپنی یا خاندان کی ذرا سی بات پر انہیں یکسر بھلا دیا اور آخر ایک جرمن بیوی تلاش کر لایا جو محض اتفاق سے ایسی پتی ورتا ثابت ہوئی کہ زیدی کی انا بھی برقرار رہی اور آخر دم تک نبھی بھی۔

افسر شاہی نظام کا MISFIT شاعر' ملازمت سے برطرفی کا فیصلہ پڑھ کر اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

"۱۷ سال کی سرکاری ملازمت کے بعد برطرف کر دیا گیا۔ آزادی عہد نو مبارک"۔

لیکن کیسی آزادی؟

عصر حاضر کے فنکار کا المیہ ہے کہ ہر وقت بجلی' پانی اور دیگر بل دروازے پر مسلسل دستک دیتے رہتے ہیں۔ فن کی جگہ ٹٹ پونجیے لوگوں کی بوٹ کی نوک پر ہے۔ فنکار مجبور ہے۔ بے بس' بے مہری اور حبس ہے' جس سے اس کا دم گھٹتا

ہے--- سکتا ہے۔

مقبولیت کی خواہش' ڈان ژوان بننے کے لئے انتہائی اقدام' جائز ناجائز اصول پرستی' مذہب سے بیزاری' ہر طرح کی دوستیاں' محبتیں اور بگاڑ یہی تمثیل ہے جو مصطفےٰ زیدی کے ہاں صلابت سے خود اذیتی تک کا سفر ہے----- یہاں تک کہ جاں سے گزرنا بھی۔

وہ بھاگ بھاگ کر سکون اور خلوص کی آغوش میں پناہ ڈھونڈتا ہے مگر جس معاشرے میں ہر چیز بکاؤ مال ہو۔ وہاں اس الوژن کی تلاش-----

اس کی دلجوئی کون کرتا۔ وہ میر صاحب کی طرح عزت دار تھا۔ جسے گلی گلی میں رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا۔

وہ کہتا ہے "بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ شریف آدمی بزدل ہو جائے"۔

آج اک افسروں کے حلقے میں
ایک معتوب ماتحت آیا
اپنے افکار کا حساب لئے
اپنے ایمان کی کتاب لئے

ماتحت کی ضعیف آنکھوں میں
ایک بجھتی ہوئی ذہانت تھی
افسروں کے لطیف لہجے میں
زہر تھا قہر تھا خطابت تھی

☆

یہ ہر اک دن کا واقعہ اُس دن
صرف اِس اہمیت کا حامل تھا

کرنٹ شرافت کے زعم کے بلوسف
میں بھی ان افسروں میں شامل تھا

وہ جس معاشرے میں سانس لے رہا تھا۔ اس کی قصابیت کا اسے بخوبی احساس تھا اور اس کے انتقام کے طریقوں سے بھی واقف۔

ملازمت میں بدی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ شاعر نے شر سے صلح نہیں کی' لیکن کیا اس طرح جان چھوٹ جایا کرتی ہے؟ شیلے نے جواں مرگ شاعر کیٹس کے مرثیہ میں کہا تھا:

"INHERITORS OF FUNFULFILLD RENDWN"

ہمارا شاعر اپنے انجام سے باخبر تھا۔

اب تو حدودِ سود و زیاں سے گزر گیا
اچھا وہی رہا جو جوانی میں مر گیا

☆

زنجیر ماتمی ہے تم اے عاقلانِ شہر
اب کس کو ڈھونڈتے ہو' دوانہ تو مر گیا

لیکن اس نے اپنے قاتل کی پہچان کی ہے' اسے دعا دی ہے:

اب میرے قاتل کو چاہو
میرا قاتل مرہم مرہم' دریا دریا' ساحل ساحل

مجبوری ــــــ عورت اور شراب۔

وہ جن الجھنوں کا شکار تھا۔ ان میں بڑی الجھن جنسی ناآسودگی تھی' پھر دیگر الجھنیں' جن کے سبب وہ سادیت اور خود اذیتی کا شکار ہوا۔

سادیت اور خودپسندی کے شکار کی سب سے بڑی خواہش اس کے OUTLET کا اس پر اختیار ہے اور اس کی طلب کڑی۔

"میں حق بجانب ہوں کہ تم سے جب' جس وقت' جو چاہوں لے لوں"۔

سادیت اور خود پسندی کے شکار مصطفےٰ زیدی کی ضروریات شدید تھیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر رہا۔ اسے ہمیشہ ایک ایسے وجود کی تلاش رہی جو اس کی سادیت اور خود اذیتی کے رجحانات کی تسکین کرے۔

فرائیڈ کے نزدیک خوداذیتی کا شکار ہونے کی دو وجوہات' انسان کے اندر کے دو رجحانات ہیں۔ جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جنسی کج روی اور موت کی خواہش' خود اذیتی کا اصل مقصد حتیٰ کہ جان سے گزر جانا بھی خود کو تکلیف پہنچانا نہیں بلکہ اذیت سے پیدا ہونے والے ہیجان سے تسکین حاصل کرنا ہے۔

فرائیڈ کے خیال میں جنسی عمل میں جو تھوڑا سا تکلیف پہنچانے کا عنصر شامل ہے۔ دراصل یہی جبلت مرگ ہے جب موت کی خواہش غالب آجاتی ہے تو لذت کی بجائے سراسر خوداذیتی کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔

کراچی' مصطفےٰ زیدی کے فلیٹ پر ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء صبح ۱۰ بجے اس تلاش کی انتہا خودکشی پر ہوئی۔ الفرڈ ایڈلر نے سادیت کے مسئلے کو موضوع بنا کر تشدد اور خود اذیتی کی معذرت پیش کر دی تھی۔ لیکن آدمی کا مقدر محض ایذا رسانی یا خوداذیتی کبھی نہیں رہا۔

رائخ' کارن ہارنی اور ایرک فرام نے فرائیڈ اور ایڈلر کے نظریات کو رد کر دیا۔ ان کے خیال میں سادیت پسندی اور خود اذیتی صرف جنسی کجروی کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی ایسے رجحانات ہیں جو آدمی کی نفسیاتی نشوونما کے لئے لازمی ہوں۔

رائخ کے نزدیک موت کی خواہش کوئی چیز نہیں نہ آدمی اذیت کی تلاش کرتا ہے۔ آدمی لذت یا نشاط ڈھونڈتا ہے۔ بلکہ خارجی ماحول کے زیر اثر اس قابل ہی نہیں رہتا کہ نشاط حاصل کر سکے' یا اس میں نشاط کو سہارنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔

چنانچہ اذیت کی تلاش ہمیشہ لذت پر ختم ہوتی ہے۔ خودکشی کے بھی یہی معنی ہیں۔ آدمی کو اس کے سوا لذت کے حصول کا اور کوئی طریقہ دکھائی نہیں دیتا۔ خودکشی کے ایک معنی یہ ہیں کہ آدمی لذت ڈھونڈتا ہے۔ لیکن لذت کی تاب نہیں رکھتا' واضح رہے کہ رائخ یہ نظریہ پیش کر کے فرائیڈ کی نظروں میں کمیونسٹ ٹھہرا تھا۔

مصطفےٰ زیدی اندر سے ایسا ٹوٹا کہ ملازمت سے برطرفی کے بعد محبوب کے دیگر چاہنے والوں سے خائف' مدت بعد وصال پر لذت کی آخری حدوں کو جاں سے گزر کر دیکھتا ہے۔ گزر جانے کے بعد اس کے سامان سے جنسی موضوعات پر لاتعداد رسائل اور مختلف ادویات ایسی ملیں جو اسکی جنسی زندگی سے پردہ اٹھاتی ہیں۔

ایرک فرام نے خود اذیتی کے رویے کو نفسیاتی خلل بتایا ہے۔ جس کی تلاش مریض کی شخصیت میں ضروری ہے۔ ایسے رجحانات انسان کے احساس تنہائی اور احساس بے چارگی سے بچنے کی کوششوں کا ردعمل ہیں۔ مصطفےٰ زیدی بھی انبوہ کی تنہائی کا شکار تھا۔ اردگرد کی دنیا سے اس کا مضبوط تعلق ٹوٹ رہا تھا۔ مخالف قوتیں اس کی نظر میں ناقابل تسخیر تھیں۔ اس نے کہا:

"کوہ ندا میری نظموں کا آخری مجموعہ ہے۔ اس "استغنا" کی وجہ میرا چھوٹا پن ہے"۔

اس چھوٹے پن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

"RECOGNITION کے بغیر ہمیشہ ہمیشہ شعر کہتے رہنا ناممکن ہے۔

کچھ دل میں یہ گمان بھی ہے کہ اکثر شعراء مجھے اس لئے ملے کہ میں سرکاری افسر ہوں اور اکثر سرکاری افسر مجھے اس لئے ملے ہیں کہ ان کی ڈرائینگ روم کی نشستوں میں میرا شاعر ہونا ان کے تفنن طبع کا باعث ہے۔ میرے ملک کے معاشرے میں اپنے جاید نظریئے کو قبول کرنا تو کیا برداشت کرنے کا ظرف نہیں ہے۔ جوش ملیح آبادی جیسے جید عالم اور کبیر شاعر یہاں حکومت اور عوام دونوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہتے ہیں۔ میں اور میرے تمام ہم عصر ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں لہٰذا جب

معاشرہ ایک فرد کو قبول نہ کرے اور فرد اس معاشرے سے مصالحت پر آمادہ نہ ہو تو شعر لکھتے رہنا جیسی عبث اور فضول کوئی اور بات نہیں ہو سکتی اور بالخصوص جب ملک کا مذہبی نظریہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہوا دکھائی دے تو خودکشی یا فرار کے سوا ایک ہی چارہ اور رہ جاتا ہے کہ قصابوں کی چھریوں سے خود کو ذبح کرانے کے لئے ہر وقت تیار رہا جائے"۔ (۴)

یہ بیچارگی کا احساس فرد کو ناقابل برداشت اذیت پہنچاتا ہے اور اذیت کو ختم کرنے کا تریاق صرف اور صرف اذیت ہے۔ مصطفےٰ زیدی نے بھی یہ سب ملیا میٹ کر دینے کی خواہش میں اپنی موت کے خواب دیکھے۔

نئے ماحول میں چھوٹی بڑی مشکلات کا سامنا کرتی ہوئی ویرا زیدی' مصطفےٰ زیدی کے لئے مستقل تحریک تھی۔

—— بیوی کے ساتھ سلوک صرف انصاف کرنے کی حد تک تھا۔ جس کا "اعتراف" مصطفےٰ زیدی نے یوں کیا ہے۔

ترا کرم جو گھٹا بھی تو بے پناہ بنا
مرا سلوک بڑھا بھی تو منصفانہ رہا
مری سیاہیٔ دامن کو دیکھنے پر بھی
ترے سفید دوپٹوں کا دل برا نہ ہوا

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا وہ :

"BEAUTY IS TO TOUCH AND POSSES NOT TO LOOK AT"

کا قائل تھا۔ مصطفےٰ حسنین زیدی سے تیغ الہ آبادی اور تیغ الہ آبادی سے مصطفےٰ زیدی تک کبھی بھی اس نے روایتی محبت نہیں کی۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایکبار ہوتی ہے اور زندگی بھر اندر ہی اندر گھلاتی رہتی ہے۔

مصطفےٰ زیدی کی پہلی دل لگی کا چرچا اس وقت ہوا' جب اس کی عمر بمشکل سترہ

برس کی تھی۔ دوسری بار اٹھارہ برس کی عمر میں بدنام ہوا' اور آخری بار موت سے پہلے۔ یاد رہے کہ سترہ سالہ مصطفےٰ حسنین زیدی' سروج بالا سرن کے عشق میں مبتلا ہونے سے تین چار برس قبل بھی (غالباً "۱۹۴۲ء") اپنے آبائی گاؤں میمن سادات' ضلع بجنور کی انجم نامی ایک دیہاتی لڑکی سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ انجم کی محبتوں کو مصطفےٰ زیدی نے قطعات بعنوان: "کون؟" "ایک خط" "دعوت جمال" اور "شکوہ خلوص" مشمولہ شعری مجموعہ: "زنجیریں" (مطبوعہ جولائی ۱۹۴۷ء) میں یاد کیا ہے۔

مصطفےٰ زیدی نے انجم اور سروج بالا سرن کے بعد بالترتیب سرلا کپور' پریم کمار جین' امریکن پروفیسر مس سمتھ' ویرا فان ٹل' دختر صادق اور شہناز گل کو چاہا۔

سروج بالا سرن: الہ آباد (بھارت) ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شنکر سرن کی بیٹی۔ یوئنگ کرسچین کالج الہ آباد میں سال اول کی ہم جماعت تھی۔

سرلا کپور: یوئنگ کرسچین کالج الہ آباد میں دوسرے سال کی ہم جماعت' ہندو لڑکی جس کا تعلق کانپور سے تھا۔

پریم کمار جین: یوئنگ کرسچین کالج الہ آباد کا ایک ہم جماعت خوبرو لڑکا۔ مجموعہ روشنی اسی کے نام معنون ہے۔

مس سمتھ: یونی ورسٹی اسلامیہ کالج پشاور میں شعبہ جغرافیہ کی استاد۔ یاد رہے کہ ۱۹۵۳ء میں برطانوی پروفیسر ڈاکٹر بروکس' امریکن پروفیسر ڈاکٹر برائے لینڈ' بلجیم کی مادام دوارا (شعبہ فرانسیسی)' مسز برائے لینڈ (شعبہ انگریزی فونٹکس)' مارگریٹ ہاربوٹل (پرنسپل گرلز کالج) اور مس سمتھ (شعبہ جغرافیہ) پشاور یونی ورسٹی سے منسلک تھے۔ مس سمتھ کے کمرے میں مصطفےٰ زیدی نے پیش دستی کی' خود بھی ملازمت سے ہاتھ دھوئے اور مس سمتھ کو بھی بدنام کر کے امریکا واپس بھجوایا۔

ویرا فان ٹل: جرمن دوشیزہ' جس سے لندن میں ملاقات ہوئی۔ ویرا نے اسلام قبول کیا اور مصطفےٰ زیدی سے شادی ہو گئی۔

دختر صادق: وہ دوشیزہ جسے ۹ جنوری ۱۹۶۰ء میں کوہ مری سے لکھے گئے خط بنام

مسعود اشعر میں آہیں بھر کر یاد کیا ہے۔

شہناز گل : گوجرانوالہ کے کشمیری خاندان کی خوبصورت شادی شدہ خاتون جو کراچی کی فیشن ایبل سوسائٹی کی جانی پہچانی شخصیت ہے۔ شہناز گل کے خاوند سلیم خان کراچی جمخانہ کے ممبر تھے۔

اس ضمن میں مصطفےٰ زیدی کے لکھے ایک طنزیہ مضمون "پاگل خانہ" سے اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ تمام تر مضمون اس کی اپنی روداد ہے:

"اس کے علاوہ آپ جانتے ہیں میں چھتیس سال کا ہو چکا تھا اور مزاج کے اعتبار سے عشق پیشہ بھی۔ پچھلے پانچ سال میں میں نے سات لڑکیوں سے محبت کی تھی اور ان میں سے تین کے لئے خودکشی کی نوبت آ چکی تھی"۔

یہ سب ایک طرح اس کی مجبوری تھی۔ جو فنکاروں کی ایک خاص قسم کی خاص مجبوری ہے۔ گلوکارہ نور جہاں سے ضیاء محی الدین نے پوچھا: "مادام اب تک آپ نے کتنے گیت گائے ہوں گے؟"

مادام ایک لحظہ کے لئے خاموش رہیں۔ پھر جواب دیا:
"میں نے کبھی گیتوں اور گناہوں کا حساب نہیں رکھا"۔

مصطفےٰ زیدی کی یہ مجبوری صرف ہندوستان یا پاکستان تک محدود نہیں رہی۔ ویرا سے یورپ میں ہی تو میل ہوا تھا۔ ہاں جس کے نزدیک گیا اپنے تئیں ٹوٹ کر چاہا۔ فراق میں راتیں جاگ کر گزاریں۔ نظمیں اور غزلیں کہیں۔ یہاں تک کہ ناکامی کی صورت میں خودکشی کی کوشش سے بھی دریغ نہیں کیا۔ البتہ جب خودکشی کی کوشش کو ناکام بنادیا گیا تو کچھ مدت بعد نئے ماحول میں نئے چہرے سامنے آنے پر اس نے دل میں ایک بار یہ ضرور سوچا کہ اس لڑکی کے پیچھے خودکشی کر لینا کوئی عقلمندی نہیں۔ چلو بھول جاؤ اسے اور اگلے روز نئے محبوب پر تازہ ترین نظم ہو گئی۔ یہ اس طرح کے مزاج کی خصوصیت ہے۔

متصادم نظریات اور سماج سے لڑائی نے اسے بے چین رکھا۔ اس نے ہر طرف

تلوار چلائی۔ اس طرح "ظاہر ہے کہ انحطاط کی مجموعی قوتوں سے لڑنے کے لئے فرد کے روحانی تصور کی نہیں بلکہ سماج کی انقلابی تنظیم کی ضرورت ہے۔ جب فرد اپنی اکائی میں ان قوتوں سے لڑتا ہے تو کلام میں تلخی کا امکان تو ہے ہزیان کا نہیں" (۸)۔
شاعری میں خطابت کے ساتھ ایسی اضطراری کیفیت پیدا ہوئی جو اس کی پہچان تھی۔

راہ چلتے خوشگوار لمحوں کی مٹ بھیڑ ہو یا ہیروشیما اور ناگاساکی کے بھرے پرے شہروں پر ایٹم بم گرائے جانے کا سانحہ وہ "کرب اسٹریٹ کی کہانی" اور "میں امن چاہتا ہوں" دونوں قسم کی نظمیں لکھنے والا شاعر ہے۔ کوئی پیارا منظر اور چھوٹا سا دکھ' دونوں اس کے جذبات کی دنیا میں تلاطم برپا کر سکتے تھے۔ ہم نے اسے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے صرف انسانیت کے سامنے جھکتے بھی دیکھا۔ ایم اے او کالج میں مظاہرہ ہوا مجسٹریٹ نے تین بار اجازت چاہی کہ طالبعلموں کی توڑ پھوڑ ختم کرنے کے لئے گولی چلانے کی اجازت دے دیں لیکن اس نے صرف اتنا کہا:
"بچوں کو پیار سے سمجھایئے گولی نہیں چلے گی۔ آخر ہم کس پر گولی چلائیں۔ اپنے بچوں پر اپنی اولاد پر؟
۱۹۵۳ء میں کراچی میں گولی چلی تو اس نے سوچا:

وہ تبسم کتنا مہنگا ہو گا تیغ
آنسوؤں کو جس نے ارزاں کر دیا

اس کی محبت اپنے وطن اور دوستوں کے لئے یکساں تھی۔ (۹)

ہم سورج کی جلتی کرنیں' چاند کی نرم پھوار
ہم دشمن کے دشمن جاں ہیں ہم یاروں کے یار

سنگا پور کے دلفریب مناظر میں بھی وہ اپنی گلیوں اور بازاروں کی تصویریں دیکھتا ہے۔ ان مناظر کا وسیع تر پس منظر اس کے اپنے گلی محلوں کی صبحیں اور شامیں ہیں۔

مرے وطن تری خدمت میں لے کے آیا ہوں
جگہ جگہ کے ظلمات دیس دیس کے رنگ

ان صبحوں اور شاموں کو سسکتے ہوئے نہیں' ہنس ہنس کر بے حال ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ ملازمت کی مجبوریاں پس پشت ڈالتے ہوئے پر آشوب دور میں۔ منیر نیازی کا ہمنوا بنتا ہے۔ تیز تر حرکت میں آہستہ خرامی اسے بھی کھٹکتی ہے۔

اے صبح کے غمزدو اس رات سے مت ڈرنا
جس ہاتھ میں خنجر ہے اس ہات سے مت ڈرنا

☆

نیچے لہو کے دھبے اور ٹہنیوں کے اوپر
خونخوار ناخنوں سے پھاڑے گئے گریباں

اعتراض کرنے والے ایک مثال کوہ مری کے ایک یادگار مشاعرے کی پیش کرتے ہیں۔ جس میں حبیب جالب اور دیگر اہم شعراء کو اس نے نظرانداز کیا کہ وہ حکومت کے خلاف بات کرنا چاہتے تھے' کیا اس موقع پر اسے مجبور نہ سمجھا جائے؟ لیکن اس کا ہر عمل عام سطح پر رکھ کر نہیں دیکھا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ اعلیٰ افسر تھا۔ اس طرح وہ چھوٹ اسے نہیں مل سکتی جو ایک عام فرد کو آسانی سے مل جاتی ہے۔

سول سروس کی انہی ذمہ داریوں نے اس کے اندر کے شاعر کو نقصان پہنچایا۔ اس کا سارا دم خم توڑ کر رکھ دیا گیا۔ ملازمت سے گلو خلاصی کے بعد اس نے سنبھالا لیا تھا "کوہ ندا" اس امر کا ثبوت ہے۔ خاص طور پر اس کی نظمیں "دیدنی" "بزدل" اور "مری پتھر آنکھیں"۔

اخبارات مسلسل اسے رشوت اور اسمگلنگ میں ملوث بتا رہے تھے۔ اس کی سچائیاں' دوستیاں اور محبتیں اس کے خلاف جا رہی تھیں۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ عزت دار رسوا ہوا۔ چھوٹے چھوٹے بونے' جنہیں وہ پرکاہ کی

اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مل مل کر اس پر حملہ آور ہوئے۔

"ایک سال سے میں بالکل تارک الدنیا ہو چکا ہوں۔ اپنی ذات کے ایک قبر نما گوشے میں چھپا بیٹھا ہوں۔ نہ یہاں تک کوئی پہنچ سکتا ہے نہ اس سے باہر نکل کر ہی کہیں جاتا ہوں۔

دنیا کے تمام کاروبار، مراسم، ملنے جلنے سے چلتے ہیں۔ میں نے ہر رسم اور ہر تعلق سے قطع خاطر کر لیا ہے۔" (خط بنام جوش تیغ آبادی)

پھر اس نے فیصلہ کیا۔

شاعر کا فیصلہ، جو کوئی سی ایس پی نہیں کر سکتا۔

اس کی لاش ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو اس کے فلیٹ میں ملی۔ شاعر نے عاشقی میں ہر رسوائی گوارا کی۔ سی ایس پی افسر وقتی مصلحتوں کا شکار رہا لیکن اہم ترین فیصلہ شاعر نے ہی کیا۔

لوگوں نے جو اس شاعر سے ناواقف تھے کہا:

"عیاش، اوباش اعلیٰ افسر کیفر کردار کو پہنچا۔"

یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

کیا اس کہانی کا اختتام انہی الفاظ پر ہو جانا چاہیے؟

☆☆

حوالہ جات و حواشی:

(۱) مکتوب بنام ابن انشاء محررہ ۲۱ دسمبر ۱۹۶۳ء

(۲) بحوالہ: "حکایت مہر و وفا" مشمولہ "المرحوم" مرتبہ، اشرف قدسی

(۳) بحوالہ: "سید مصطفیٰ زیدی: نئے انکشافات" از بیدار سرمدی، مطبوعہ:

"نوائے وقت" لاہور ۲۹ نومبر ۱۹۸۵ء

(۴) بحوالہ: "پاگل خانہ" از مصطفےٰ زیدی مطبوعہ: "افکار" کراچی اکتوبر ۱۹۷۳ء

(۵) بحوالہ: "میرے بچپن کا ساتھی" از ابن صفی' مطبوعہ: "نقش" کراچی زیدی نمبر

(۶) بحوالہ: "حرفِ آخر" از مصطفےٰ زیدی' مشمولہ "کوہ ندا"

(۷) یہ مضمون مصطفےٰ زیدی نے "چچی" کے فرضی نام سے لکھا تھا۔ دیکھیے "افکار" کراچی' شمارہ اکتوبر ۱۹۷۳ء

(۸) بحوالہ: "اپنا دیواں بغل میں داب کے میر" از مصطفےٰ زیدی

(۹) نظم "بہ زبانِ عوام" مشمولہ "الرحوم" - ۶۵ء کی جنگ کے موقع پر لکھی گئی۔

شہر در شہر پھری میرے گناہوں کی بیاض

مصطفیٰ زیدی:

پیدائش: ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء محلہ رانی منڈی' الہ آباد- بھارت-

والد کا نام سید لخت حسنین زیدی' ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس- سید لخت حسنین زیدی صاحب نے دو شادیاں کیں'

پہلی شادی سے اولاد: احمد رضا' حیدر رضا' امیر رضا' عابد رضا اور ناصر رضا

دوسری شادی سے ـــــ مجتبٰے حسنین زیدی' مصطفیٰ حسنین زیدی اور ارتضیٰ حسنین زیدی-

آبائی گھر: میمن سادات' ضلع بجنور-

یہ کنبہ بچوں کی چھٹیوں میں اکثر میمن سادات چلا جاتا یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک رہا-

مستقل قیام: ۸ کولس ٹولہ اسٹریٹ' الہ آباد نمبر ۳ (جسے مصطفیٰ زیدی نے ہمیشہ "آتش کدہ" کہا)

☆

•

تحریک خلافت کے عروج کا زمانہ تھا- مولانا محمد علی جوہر کے خلاف حکومت نے کراچی (خالق دینا ہال) میں مقدمہ چلایا- پولیس کی جانب سے اس مقدمہ میں پیروی مصطفیٰ زیدی کے والد سید لخت حسنین زیدی' ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس الہ آباد کر رہے تھے-

دوران مقدمہ مولانا محمد علی جوہر نے ایک پرزے پر یہ شعر لکھ کر لخت حسنین زیدی صاحب کو پکڑا دیا-

محمدؐ کا دشمن علیؓ کا عدو
نہ کہہ اپنے کو لخت حسنین تو

کچھ دیر بعد لخت حسنین صاحب نے بھی ایک شعر جواب میں لکھ کر مولانا کو دیا۔

علیؓ اور محمدؐ سے کیا تجھ کو کام
تو کر اپنے گاندھی کی حجت تمام

(نگار نئی دہلی۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء)

مصطفےٰ زیدی کی پیدائش ہندوستان کے اسی اہم دور میں ہوئی۔ ان دنوں سیاست اور ادب کے افق پر بہت سے تابناک ستارے روشن تھے۔ ہندوستان کے ہر فرقے اور مذہب سے بہت ذہین لوگ سامنے آئے تھے جنہوں نے سیاست اور ادب میں بغاوت کی داغ بیل ڈالی۔ اس احیاء معاشرت و سیاست' نیز ادب نے عوامی ذہن پر گہرے اثرات چھوڑے۔ یہ جدید ہندوستان کا نقطہ آغاز تھا۔ غلام ہندوستان کا ہر فرد بغاوت پر آمادہ تھا' آزادی چاہتا تھا۔

ایسے میں مسلمان دو واضح دھڑوں میں بٹ کر سامنے آئے تھے۔ ایک وہ جو خلافت تحریک کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز سمجھ رہے تھے اور دوسرے وہ جو مسلمانوں کی تاریخ کی اس اہم تحریک کو محض گاندھی جی کے اشارے پر ہلکان ہوتا خیال کرتے تھے۔

اسی ہیجانی اور جدیدیت کے ہمنوا کروٹیں لیتے ہوئے عہد میں مصطفےٰ زیدی نے شعور سنبھالا۔ گھر میں پیار کی وہ شدت نہ ملی جو ان سے بڑے بھائیوں کے لئے مخصوص تھی اور یہ احساس محرومی اس وقت بہت بڑھ گیا جب اوائل عمری میں ہی محبت کی اور ناکامی کا منہ دیکھا۔ گھرانہ شیعہ تھا اس لئے مجلسوں میں جانے کا موقع ملا۔ آواز اچھی تھی۔ کبھی کبھار مرثیہ یا سلام پڑھنے کو بھی کہا جاتا۔ اب ادب اور مذہب دونوں سے ربط بڑھا اور یہ ربط ناکام لڑکپن کے لئے کنج عافیت تھا۔

اور باہر کی دنیا ———

خود سید لختِ حسنین زیدی کے سیاسی نظریات کے حوالے سے' سیاست کے میدان میں باغی رجحانات اور ادب میں جوش ملیح آبادی' مجاز لکھنوی' فراق گورکھپوری اور احسان دانش کی پیدا کردہ باغیانہ فضاء جس میں اختر شیرانی کی رومانی آواز شامل ہو کر تاثر کی شدت کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ سیاست اور ادب دونوں کی بلند آہنگی اور باغیانہ فضا نے اپنا اثر دکھایا' آگے آگے رومانیت میں رچی ہوئی ترقی پسندی نے مصطفےٰ زیدی سے مذہب کی جائے پناہ بھی چھین لی۔ ہندوستان کی اس رومانوی فضا میں ایک رخ بغاوت تھا اور دوسرا عشق' جذبے کا بے پناہ اظہار' معاشرتی پابندیوں کی توڑنے کی کوشش ———

اب اگر گھر میں کھانا وقت پر نہیں ملتا تو بھوکے رہ لیں گے لیکن کھانا نہیں کھانا۔ بال بڑھا لئے۔ لباس کے معاملے میں لاپروائی۔ مصطفےٰ زیدی اہل دنیا کی نظر میں اپنے آپ کو ضائع کرتا ہے۔ زندگی کرنے کے رویے کے اعتبار سے میں اسے جوش ملیح آبادی کے قریب سمجھتا ہوں اور پھر جوش کے نظریات' لہجہ اور زبان غرض یہ کہ سب کچھ مصطفےٰ زیدی نے اپنایا۔ لیکن خود کو ظاہر کیا تو مجاز لکھنوی کے روپ میں۔ مجاز جس کا ظاہر زیادہ شاعرانہ تھا۔ البتہ شعوری سطح پر وہ مجاز سے کبھی متاثر نہیں رہا بلکہ

ایک زمانے میں تو اس نے مجاز کی مشہور نظم "آوارہ" کی پیروڈی بھی لکھی۔

اک پہ شعلہ' ایک پر یہ برف کی سل کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یا مجاز کی غزل کے بارے میں یہ کہنا کہ :

ہند کے مردُ تو ہی کہہ ——— ہند کی زن کو کیا ہوا

جہاں تک فراق اور احسان دانش کا تعلق ہے' یہ دونوں اس وقت کی گمبھیر آوازیں تھیں' جو لاشعوری طور پر اثر انداز ہوئیں۔بقول ڈاکٹر سید محمد عقیل' مصطفےٰ زیدی کا

اسکول کے زمانے سے ہی مستقل طور پر الہ آباد کے گھنٹہ گھر کے سامنے والی لائبریری میں آنا جانا رہا۔ اکثر چھوٹا بھائی ارتضیٰ زیدی بھی ساتھ نظر آتا۔ ارتضیٰ زیدی بچوں کی کہانیاں پڑھتا رہتا اور مصطفےٰ زیدی اپنی پسند کے موضوعات کی تلاش میں کھویا رہتا۔ دونوں بھائی سخت بیماری کی حالت میں بھی بلاناغہ لائبریری جاتے۔

لاابالی پن اور بات پر بگڑ جانے اور خفا ہو جانے کی عادت مصطفےٰ زیدی میں بچپن سے تھی۔ اس لئے ماڈرن ہائی سکول الہ آباد کے ہم مکتب اس کو "بگڑو" کہتے۔ اسے اکثر اس نام سے پکارا جاتا لیکن دوستوں کی اس چھیڑ چھاڑ کا کبھی اس نے برا نہ منایا۔ آہستہ آہستہ اس میں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ بال تو بہت مدت سے بڑھا ہی رکھے تھے۔ ایک دن کھدر کا کرتہ پہنے ناخن بڑھائے سفید چپل (جسے قصداً" جگہ جگہ سے پھاڑ دیا گیا تھا) پہنے عجیب طرح کی شکل بنائے دوستوں کی محفل میں آیا۔ وجہ پوچھی گئی تو بولا "کچھ نہیں میں اپنے کو "ڈی کلاس" کر رہا ہوں' آج کل مارکسی لٹریچر کا مطالعہ کر رہا ہوں تم لوگ بورژوا ذہنیت والے ان باتوں کو نہیں سمجھتے"۔ ظاہر ہے کہ ان تمام لڑکوں کے لئے یہ باتیں عجیب و غریب اور یہ تمام الفاظ غیر مانوس تھے۔ مارکس اور اینگلز کے نام تمام لڑکوں نے پہلی بار سنے تھے۔ سب مصطفےٰ زیدی کے گرد جمع ہو گئے۔ مصطفےٰ حسنین پہلے تو کچھ ہنسا' کچھ منہ بنا بنا کر جتایا اور کچھ باتوں کے متعلق کہا کہ تم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس کی اس تبدیلی کو بھی بگڑو پن' کا ہی نام دیا گیا۔ لیکن اس دن سے مصطفےٰ زیدی نے ہمیشہ کے لئے وہ حلیہ اپنا لیا۔ اب لڑکے سوچنے لگے کہ واقعی حسنین گہری باتیں پڑھتا اور سوچتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے تمام ہم جماعتوں میں سب سے الگ سب سے منفرد نظر آیا۔

بچپن میں کچھ مدت مصطفےٰ زیدی کو مذہب سے بے حد وابستگی رہی تھی وہ نماز روزے کا پابند تھا اور مذہبی کتابوں کے علاوہ مختلف وظائف پڑھتا اس کا معمول رہا۔ جمعہ کے دن حضرت جعفر طیار کی نماز بھی پڑھتا رہا۔ اس زمانے میں اس نے ہزار دانہ تسبیح بنوائی اور اکثر ورد کرتا نظر آیا۔ یہ اسی دور کے اثرات ہیں جو اس کی شاعری

میں آخر تک اکثر علامت اور استعاروں کا بروپ دھارتے رہے۔ ان دنوں ماڈرن ہائی اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر گھوش تھے جو مسمریزم اور روحوں سے ملاقات کرانے کے لئے خاصے مشہور تھے۔ اتفاقاً وہ سخت بیمار پڑے اور ان کی جگہ ایک اور استاد نے لی۔ نئے پرنسپل ہفتے میں ایک دن اسکول کے ہال میں لڑکوں کو جمع کر کے اخلاقیات کا درس دیتے اور بعد میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا۔ اس مشاعرے میں اعلان ہوا کہ اب مصطفےٰ حسنین ایک نظم بعنوان "معطان" پیش کریں گے۔ لڑکوں نے خوب تالیاں بجائیں' قریبی دوست حیران تھے کہ حسنین شاعر کب سے بن گیا۔ آخر عجیب و غریب حلیے میں اسٹیج پر نظر آیا اور ترنم سے نظم پڑھنا شروع کی۔ ترنم سے پڑھنے میں آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ لڑکوں نے آوازے کسنے شروع کر دئے۔ ہنگامہ اتنا ہوا کہ سر جھکا کر اسٹیج سے نیچے آگیا مگر چند لمحوں بعد دوبارہ اٹھا اور پرنسپل سے نظم دوبارہ پڑھنے کی اجازت چاہی۔ اجازت مل گئی چنانچہ وہی نظم تحت اللفظ سے پڑھنا شروع کی' آواز رعب دار تھی' دیکھتے ہی دیکھتے شور مچاتے آوازے کستے مجمع پر چھا گیا۔ اسکول میں "بزم اردو" قائم کر دی گئی تھی جس کا کام مشاعرے ترتیب دینا تھا۔ مصطفےٰ حسنین کو اس بزم کا سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ مارچ کی ابتداء تھی۔ انہی دنوں انجمن کی طرف سے پہلے طرحی مشاعرے کا اعلان ہوا۔ باقاعدہ کارڈ چھپوائے گئے اور مختلف لڑکوں نے اپنے اپنے تخلص مقرر کر کے الٹی سیدھی تک بندی شروع کر دی۔ اب مصطفےٰ حسنین نے تیغ تخلص کیا اور تیغ الہ آبادی کہلایا۔ تیغ الہ آبادی نے اسکول اور گھر پر طالب علموں کو جمع کر کے بیت بازی اور ادبی مجلس کرانی شروع کر دی۔ اکثر انعامی مقابلوں کا اہتمام کرتا اور اپنی طرف سے کپ' کتابیں اور رومال وغیرہ انعام کے طور پر دیا کرتا۔

ان ہی دنوں مصطفےٰ حسنین تیغ نے انکشاف کیا کہ وہ لکھنؤ میں حضرت جوش ملیح آبادی سے ملا تھا اور باقاعدہ طور پر ان کا شاگرد بھی ہو گیا ہے' اس نے جوش کا نیا شعری مجموعہ "سنبل و سلاسل" دوستوں کو دکھایا جس پر لکھا تھا "تیغ کے لئے" اور نیچے جوش کے دستخط تھے' ساتھ ہی شنکر راؤ چلیں پوتا لکھا تھا۔ اس شعری مجموعے کو دیکھ

کر دوستوں پر خاصا رعب پڑ گیا کہ جوش ملیح آبادی جیسے بڑے شاعر سے اس کی جان پہچان ہے۔ ڈاکٹر سید عقیل ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ دوستوں میں شیخ محی الدین جو بڑا ذہین طالب علم تھا۔ ایک دن مجاز کا مجموعہ "آہنگ" لے آیا اور انکشاف کیا تیغ نے مجاز کی نظم اپنے نام سے پڑھ کر سنائی ہے۔ مصطفےٰ حسنین تیغ سے پوچھا گیا تو جواب میں ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا اور کہنے لگا "بھئی میں تو تم سب کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ یہ نظم تو مجاز کی مشہور نظم ہے" وہ جوش ملیح آبادی کے مرثیے "حسین اور انقلاب" سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی رنگ اور انداز کا مرثیہ لکھ مارا اور بڑے فخر سے دوستوں کو سناتا پھرا۔ ہائی اسکول کے ہی زمانے میں تیغ نے اپنا ایک شعری مجموعہ مرتب کر لیا تھا۔

اس بیاض کا نام "روحِ عصر" تجویز کیا اور چھپوانے کی فکر میں لگ گیا۔ اس مجموعہ کی پہلی نظم ملاحظہ ہو:

زندانِ تصور کا ہوں قیدی مگر اے تیغ
محبوبِ خیالی کا گرفتار نہیں ہوں

ہر چند نہ روزے، نہ نمازوں کا ہوں حامی
میں دیر نشیں، شیخِ ریاکار نہیں ہوں

مجموعۂ اضداد ہوں افکار کا پیکر
تلوار کبھی ہوں کبھی تلوار نہیں ہوں

اشعار میں رسمی گل و بلبل نہیں میرے
میں خلوتیِ شاہد رخسار نہیں ہوں

سرمائے کے مندر کے پجاری سے ہے نفرت
ادبار کے کاندھوں پہ کوئی بار نہیں ہوں

ہوں معترف ان سب کے کمالات کا لیکن
میں غالب و سودا کا پرستار نہیں ہوں

ہے فخر کہ میں جوشِ سخنداں کا ہوں پیرو
اور کش مکشِ زیست سے بے زار نہیں ہوں

سالانہ امتحانات آئے تو شعر و سخن کی محفلیں درہم برہم ہو گئیں۔ مصطفےٰ زیدی نے میٹرک کا امتحان (۱۹۴۵ء) اتر پردیش بورڈ سے درجہ دوم میں پاس کر لیا۔ ذہین اور محنتی تو تھا ہی لیکن ریاضی کا مضمون اس کے بس کی بات نہ تھی' یہی وجہ تھی کہ امتیازی نمبر حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

میٹرک کر لینے پر بڑے بھائی احمد رضا کے کہنے پہ ایگریکلچر کالج کانپور میں داخلہ لے لیا۔ احمد رضا ملازمت کے سلسلے میں کانپور ہی میں تعینات تھے۔(۱) کانپور میں مصطفےٰ زیدی کا قیام انہیں کے ہاں رہا اور تعلیمی سلسلہ چل بھی نکلا' لیکن "علم زراعت" ہمارے شاعر کے مزاج کے خلاف تھا وہ کاشتکاری پر دھیان نہ دے سکا اس لئے کہ شاعری بڑے زوروں سے جاری تھی۔ پہلے ہی سال سالانہ امتحان میں فیل ہو گیا۔ سو جب جولائی ۱۹۴۶ء میں یونگ کرسچن کالج الہ آباد میں داخلے شروع ہوئے تو مصطفےٰ زیدی نے وہیں داخلہ لے لیا۔ ایگریکلچر کی تعلیمی مصروفیات کے دوران اس کی کچھ نظمیں مختلف اوقات میں ادبی پرچوں میں چھپتی رہی تھیں اس لئے مصطفےٰ زیدی کی الہ آباد واپسی اب ایک جانے پہچانے شاعر کا ظہور تھا' البتہ کانپور کے بیتے ایام کی یادگار' فوٹو گرافی کا شوق رہ گیا تھا۔ اس لئے کہ بھائی احمد رضا خود اچھے فوٹو گرافر تھے۔ مصطفےٰ زیدی آخر دم تک اس شوق کو گلے لگائے رہا۔

مصطفےٰ زیدی کا ذہن باغی تھا اور اس کے درشت مزاج سے اکثر اعزاء پریشان رہتے تھے۔ اس انتہا درجہ کے مذہبی گھرانے میں "تیغ" جیسے باغی ذہن کو برداشت کرنا مشکل تھا۔

احمد رضا خود بڑے مذہبی آدمی تھے اور ان دنوں تیغ پر لامذہبیت کا بھوت سوار تھا بات بات پر ٹوکا جاتا۔ نتیجہ تنگ آکر تیغ نے بڑے بھائی احمد رضا کے خلاف بھی ایک نظم لکھ ڈالی جس کا ایک شعر کچھ یوں تھا:

حضرت احمد رضا کو کوئی سمجھا دے یہ بات
مادہ الٹے گا اک دن روح کی کل کائنات

انہی دنوں کا ایک قصہ محمد طفیل نے "قبائے ساز" کی تقریب رونمائی کے موقع پر سنایا۔ انہی کے ہی الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"میں بات ۱۹۴۵ء کی کر رہا ہوں۔ اس وقت یہ تیغ الہ آبادی تھے اور میں صرف پبلشر۔ ان کا خط آیا جس میں یہ رقم تھا کہ "آپ جو فلاں مصنف کی کتابیں دھڑا دھڑ چھاپ رہے ہیں ان میں کیا رکھا ہے؟ آپ کیوں لوگوں کا مذاق خراب کر رہے ہیں؟ ان دنوں میں نے سوچا یہ عجیب آدمی ہیں۔ مذاق لوگوں کا خراب ہوتا ہے' اور پریشان آپ ہیں۔ چنانچہ مسئلہ کا حل میں نے وہی نکالا جو افسران ٹاپ کے لوگ نکالتے ہیں' یعنی نوٹس ہی نہ لیا جائے۔ ہاں تو صاحب میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان کا وہ خط جو میرے نام ۱۹۴۵ء میں آیا تھا اور جس کا میں نے یہ حل ڈھونڈا تھا کہ نوٹس ہی نہ لیا جائے۔ اس کا حشر یہ ہوا کہ اس خط کے کوئی پندرہ بیس روز بعد ان کا پھر ایک خط آدھمکا جس میں یہ دھمکی تھی:

"اگر آپ نے میرے خط کا جواب نہ دیا تو پھر میں اخباروں اور رسالوں میں مضمون لکھوں گا"۔ جب اس مضمون کا خط آیا تو میں نے سوچا' یہ تیغ صاحب مجھے ضرور تہہ تیغ کریں گے۔ چنانچہ اس خط کا میں نے جو جواب دیا وہ کچھ یوں تھا۔

"اس مصنف کے سیکڑوں نہیں ہزاروں مداح ہیں۔ مگر ان میں آپ کا یہ مخالفانہ خط میرے لئے ہزاروں مداحین سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ تھوڑا سا مسکہ کام آگیا۔ پھر ان کا کوئی خط نہ آیا میں نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا۔"

ابن صفی لکھتے ہیں (۲) ۱۹۴۶ء کی بات ہے ان دنوں میں یوئینگ کرسچین کالج الہ آباد میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ غالباً" دسمبر کے اواخر کی ایک خوشگوار شام تھی اور ہم سب سالانہ مشاعرے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس زمانے میں اپنا ذریعہ عزت شاعری ہی تھی اور کالج کے "بڑے شعراء" میں شمار ہونے کی بنا پر "بزم ادب کی

صدارت بھی میرے ہی حصے میں آئی تھی۔ لہٰذا مشاعرے کے انتظامات میں میرا دخل ہونا ضروری ٹھہرا۔ مشاعرہ غیر طرحی تھا۔ صدر شعبہ اردو مولانا انور الحق صاحب کی تجویز تھی کہ طالب علم شعراء جو غزل یا نظم پڑھنا چاہیں' وہ پہلے انہیں دکھائی جائے۔ موصوف نہیں چاہتے تھے کہ کالج کا کوئی طالب علم غیر معیاری کلام پیش کرے۔ ان غزلوں کو دیکھنے کے لئے مولانا نے جن طلباء کا انتخاب کیا ان میں میرا نام بھی تھا۔ بہرحال مولانا کی نگرانی میں یہ کام شروع ہوا تھا کہ ایک صاحب بولے "فرسٹ ایئر کے طالب علم نے اس طریق کار پر شدت سے احتجاج کیا ہے اور اس نے اپنی نظم نہیں دی" استفسار پر معلوم ہوا کہ مصطفےٰ حسنین ہیں اور تیغ تخلص کرتے ہیں۔

مولانا بولے "بے نیام ہی معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں بلاؤ---!"

تھوڑی دیر بعد جو صاحب زادے تشریف لائے انہیں دیکھ کر مولانا نے کہا "ارے آپ شاعر ہیں مجھے نہیں معلوم تھا" وہ بڑے شرمیلے انداز میں مسکرائے اور سر جھکا لیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ انہیں "تیغ" کیسے سوجھی یہ تو "نوح" کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ "لائیے نکالیے اپنی نظم"۔ مولانا نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ انہوں نے جیب سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر مولانا کے حوالے کیا اور بت بنے کھڑے رہے۔ کچھ عجیب سی ہیئت تھی۔ شیروانی کا ایک بٹن غائب تھا۔ چوڑی موری کے پاجامے کا ایک پائنچہ دوسرے سے کسی قدر اونچا نظر آ رہا تھا۔ بال الجھے ہوئے' مونچھیں اپنے طور پر بڑھ کر شاید ڈاڑھی کی منتظر تھیں۔ بہرحال چہرہ ابھی اندر سے روشناس نہیں ہوا تھا۔ مولانا نے نظم دیکھی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں نے نظم دیکھی اور سوکھا سا منہ بنا کر کہا "جوش کی نقالی ہے" اور مجھے اس منحنی لڑکے کی آواز نے چونکا دیا۔ عجیب سی گونج اور گرج تھی اس کی آواز میں--- کہنے لگا "میں جانتا ہوں نوح ناروی کے بھانجے ہیں' آپ سے باہر بات کروں گا" میں نے کہا "میاں کیا مارو گے"۔

"جی نہیں۔ آپ کو بتاؤں گا کہ جوش کی نقالی مجھے ایک دن کیا بنانے والی ہے"

مولانا نے بات آگے نہ بڑھنے دی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس کے بعد ہم باہر بھی

ملے لیکن تیغ نے اس گفتگو کا حوالہ کبھی نہ دیا۔ پھر ہم بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔

"مولانا انور الحق صاحب بڑے دل چسپ اور باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ کلاس میں ان سے خوب نوک جھونک رہتی مولانا جو مطلب بتاتے فوراً" اس کے الٹ معنی نکال کر کہا جاتا کہ یہ "معنی بھی ہو سکتے ہیں؟" مولانا ذرا خفا نہ ہوتے البتہ خاص زوردار لہجے میں فرماتے غلط بالکل غلط' کہئے لاحول ولا قوۃ اور آگے چلیے" مولانا فارسی بھی پڑھاتے اور اردو بھی۔ ان کو مصطفےٰ حسنین تیغ اور اس کے ساتھیوں نے بہت بہت چھیڑا لیکن وہ ہمیشہ شفقت کا برتاؤ کرتے۔ ان کے ہی کہنے پر تیغ نے انٹر میں فارسی مضمون لیا تھا"۔

خود مصطفےٰ زیدی نے اپنے ایک مضمون "مجاز' نورا' شمیم امیر بھائی اور میں" میں بڑے دل چسپ انداز میں ان دنوں کے متعلق لکھا ہے:

"الہ آباد کے جس گھر میں ہم تین بھائی مجتبےٰ' مصطفےٰ اور ارتضیٰ فورتھ ایئر فرسٹ ایئر اور نویں درجے میں پڑھتے تھے' اس کا ماحول ہی عجیب تھا۔ ہم تینوں سے بڑے جو تین بھائی ملازمتوں کے سلسلے میں لکھنؤ انگلستان اور بنارس رہتے تھے ان کے بارے میں سنا تھا کہ والد صاحب سے ان کا ہمیشہ نظریاتی اختلاف رہتا تھا۔ اور اب والد صاحب سے ہم تینوں میں سے بھی کسی کی نہیں بنتی تھی۔ آپس میں بھی ہم تینوں بہت مختلف تھے۔ سب سے بڑے بھائی مجتبےٰ کو ہر درجے میں فرسٹ کلاس ملنے کے علاوہ' والی بال اور کرکٹ میں بھی بہت انعام ملتے رہتے تھے۔ مجھے فرسٹ کلاس ملنے کے علاوہ کچھ نہیں ملتا اور سب سے چھوٹے بھائی ارتضیٰ کو گھر کے کاموں میں سب سے زیادہ دل چسپی تھی۔

مجتبےٰ صاحب سے جس دن میرا تاریخی جھگڑا ہوا تھا اس دن ان کو اپنی ایک نظم اور مضمون پر یونیورسٹی میگزین میں سب سے نمایاں جگہ ملی تھی۔ جھگڑا اس بات پر ہوا تھا کہ یہ نظم اور مضمون لکھے ہوئے میرے تھے اور چھپے ان کے نام سے تھے اور مجھے سب سے زیادہ طیش اس بات پر تھا کہ اس شخص کو نظم اور نثر دونوں سے محض واجبی

سا تعلق ہے اور اس کو جو ڈسٹنکشن ملا ہے وہ اس نے اسی طرح خوشی سے قبول کر لیا ہے جیسے والی بال پرائز۔

بہر حال مجھے ان سے تعلق خاطر بھی تھا۔ اس لئے کہ کتابستان یونیورسٹی سے نزدیک تھا اور وہ کبھی کبھی میرے لئے کتابیں اپنی اوقات سے زیادہ تک خرید لاتے تھے۔ ایک دن مجتبیٰ صاحب گھر آئے تو نظموں کی ایک کتاب لیکر آئے اور اس لئے بالکل مطمئن رہے کہ کتاب اتنی سستی تھی کہ اس سے ان کے سینما اور کلب کے چندے وغیرہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ایک اچھی بھلی کتاب نہ صرف دو روپے کی تھی بلکہ جب وہ کتابستان میں اس کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے تو اس میں یہ نظم بھی ان کی نظر سے گذری تھی۔

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے

اور عورت کے لفظ کو شعر میں اس طرح پڑھا جاتا تھا جیسے چھپا کر ننگی تصویریں دیکھی جاتی ہیں۔ جوش صاحب کو میں چوتھی جماعت سے پڑھتا آرہا تھا لیکن ان کی کتاب خریدنے پر اس زمانے میں پورا ایک ماہ کا اثاثہ ختم ہو جاتا تھا' یہ کتاب دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ میرے بھائی کو تو "وہ اس دنیا کی عورت ہے" نے کاؤ بوائے بنایا ہوا تھا لیکن میں نے "موت اور ریل" اور "اے غم دل" پڑھیں تو کچھ دنوں کے لئے جوش کا مطالعہ ترک کر دیا"۔ (۳)

وقت گزرتا رہا تیغ' عقیل اور محی الدین کرسچن کالج کے ادبی ہیرو بن گئے۔ اردو اور انگریزی کے تمام مسائل پر طالب علم ان سے رجوع کرتے اور ان کا مشورہ حرف آخر سمجھا جاتا۔ سہ ماہی امتحان میں عقیل (ڈاکٹر محمد عقیل) تمام طلبہ میں اول رہے' محی الدین دوم اور تیغ (مصطفےٰ زیدی کی تیسری پوزیشن) تھی لیکن تیغ شروع سے ہی محنتی اور کسی حد تک ضدی تھا اس نے اپنی ہار بہت کم مانی۔ اب وہ اپنے ان دوستوں سے کچھ کھنچا کھنچا رہنے لگا اور بالآخر دو گروہ بن گئے۔ محی الدین کے ساتھ آرٹس کے

کچھ لڑکے تھے اور تیغ کے ساتھ سائنس کے تمام لڑکے۔ باوجود اس کے کہ تیغ آرٹس کا طالب علم تھا۔ اب تیغ نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی تھی۔ شہر کے مشاعروں میں حصہ لیتا اور مختلف ادبی حلقوں میں حاضری رہتا۔

ان ہی دنوں اس کی فراق گورکھپوری سے ملاقات ہوئی۔ فراق بڑی شفقت سے پیش آئے اور ہمت افزائی کی۔ مصطفےٰ زیدی نے بلاناغہ ان کے گھر جانا شروع کر دیا اور اپنے کلام پر اصلاح بھی لینے لگا۔ فراق سے تعلقات کا یہ عالم تھا کہ فراق جس مشاعرے میں جاتے' تیغ کا ساتھ ہونا ضروری سمجھا جاتا۔ فراق گورکھپوری ان دنوں "روپ" کی تکمیل میں مصروف تھے۔ مصطفےٰ زیدی نے بھی فراق کے رنگ میں بہت سی رباعیاں کہہ ڈالیں جو کالج میگزین میں شائع ہوئیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب مصطفےٰ زیدی ترقی پسند ادب سے باقاعدہ طور پر روشناس ہوا۔ اس نے چند دنوں میں ہی کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے سارے افسانے پڑھ ڈالے۔ پھر اسے ترقی پسند شاعری اور ادیبوں سے تعلقات بڑھانے کا موقع بھی مل گیا۔ اسی دور نے اس کی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ الہ آباد میں قیام کے آخری زمانے میں فراق' جوش' مجاز اور علی سردار جعفری سے خاصے تعلقات رہے۔

بقول مصطفےٰ زیدی: "والد صاحب شعر' کمیونزم اور جنون کو ایک ہی بات سمجھتے تھے۔ جوش صاحب ایک بار میرے ساتھ گھر پر آئے تھے تو والد صاحب نے ان کا اس لئے احترام کیا تھا کہ جوش صاحب مشہور شاعر ہونے کے علاوہ شکل و صورت سے نواب بھی معلوم ہوتے ہیں۔ میں ذہنی اعتبار سے کمیونسٹ' ملحد اور نہ جانے کیا کچھ ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ کھانا گھر پر کھاتا تھا' پہنتا گھر سے تھا اور تعلیم والد صاحب کے پیسے ہی سے ہوئی ہے۔ لہٰذا بہت دبا گھٹا رہتا تھا۔ اس زمانے میں مجھ میں گھر چھوڑ دینے کی اخلاقی جرات کبھی نہیں ہوئی۔ مجتبیٰ صاحب کو زیادہ کھیلنے کودنے پر گاہے گاہے سرزنش ہوتی تھی۔ لیکن وہ سن کر ٹال جاتے تھے اور دوسرے دن پھر کلب سے دیر میں آتے تھے۔ مجھ سے کبھی "گفت و شنید" کی نوبت آتی تھی تو میں بہت کھولتا تھا اور

سخت معرکہ ہوتا تھا۔ طبع کے علاوہ یہ کچھ جوش صاحب کے بہت سے دیوان پڑھنے کا بھی نتیجہ تھا۔ اس گھر میں ظاہر ہے کہ مجاز کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ایک روز صبح صبح ارتضٰی نے کہا کہ مسعود اختر جمال آپ کو پوچھ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب ہیں۔ میں باہر آیا تو جمال کے ساتھ مجاز تھے۔ خیروعافیت پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ تو خیریت سے ہیں لیکن میں خیریت سے نہیں ہوں۔ اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ میرے ساتھ ٹھہریں۔ میں نے بہرحال پاس ہی محمود آغا صاحب کے مکان پر ایک کمرہ ان کے واسطے درست کرادیا اور وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ تھوڑی دیر بعد اپنا سامان لے کر آئیں گے۔

یہ تھوڑی دیر بعد شام کو وہ بغیر سامان کے آئے اور کہنے لگے "تم ٹھہرنے ٹھہرانے کے بندوبست کو چھوڑو۔ بس تم خود میرے ساتھ چلو۔ سخت ضروری کام ہے" مجھے لیکر شراب خانے پہنچے۔ غالباً" رم کی نصف بوتل لی۔ جس کی قیمت سولہ روپے تھی۔ مجھ سے کہنے لگے "آج شام کو فراق صاحب کے یہاں جانا ہے کل گیا تھا تو ان کے ساتھ پی تھی۔ لیکن چلتے وقت انہوں نے کہا تھا کہ کل آنا تو اپنی بوتل لیکر آنا میرے پاس بالکل پیسے نہیں ہیں۔ تم بوتل مجھے خرید دو۔" میرے پاس اس وقت سولہ روپے کے نصف سے نصف بھی نہیں تھے اور جب میں نے یہ بات کہی تو نہ جانے مجاز کے دل میں یہ بات کیسے آئی کہ میں خساست سے کام لے رہا ہوں۔ وہ پہلے تو اصرار کرتے رہے پھر کہنے لگے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں' میرے والد کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ میرے بڑے بھائی آئی سی ایس کے سینئر افسر ہیں۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے پاس نصف بوتل کے پیسے نہ ہوں۔ مجھے مجاز پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے غصہ کا اظہار تک کرنا گوارا نہ کیا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ فراق صاحب سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتے اور شراب بھی پینا چاہتے ہیں تو آپ میرے ساتھ فراق صاحب کے ہاں چلئے ان کو کم از کم میرے بارے میں اتنا ضرور معلوم ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں ان سے آپ کے لئے بوتل قرض لے لوں گا اور جب پیسے ہونگے ان کی بوتل انہیں واپس کر دوں گا۔ مجاز اس وقت شراب کی خواہش میں اتنے بے تاب تھے کہ وہ

اس بات پر آمادہ ہو گئے۔

فراق صاحب کے یہاں انھیں پہنچا کر اور ان کی شراب کا بندوبست کر کے جب میں بارش میں بھیگتا ہوا گھر واپس آیا تو مجھے تیز حرارت تھی۔ صبح ارتضیٰ نے کہا کہ "مجاز صاحب آئے ہیں" تو میں نے کہا کہ "ان سے کہہ دو میں گھر پر نہیں ہوں۔" ارتضیٰ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور اس نے کہا "وہ چلے گئے ہیں لیکن یہ پرچہ دے کر گئے ہیں" پرچے پر مجاز نے لکھا تھا "مجھے معلوم ہے کہ آپ گھر پر ہیں۔ میں نے آج تک کسی سے معافی نہیں مانگی"۔ مجاز

ایک دو دن طبیعت مکدر رہی۔ اس کے بعد مجاز لکھنؤ واپس جا چکے تھے اور میں اپنے کاموں میں لگ گیا"۔(۴)

امتحانات کے دن قریب آرہے تھے۔ شاعری اور درسی کتابوں کا مطالعہ زوروں پر تھا۔ اب مصطفےٰ زیدی اپنی سہ ماہی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ جو کتاب' ان دنوں میں پڑھتا اس پر تبصرہ ضرور کرتا جاتا۔ کتاب کا آخری صفحہ تبصرہ کے لئے ہوا کرتا تھا اور بعض اوقات جلی حروف میں یہاں تک لکھ دیا کرتا کہ "مزید معلومات کے لئے تیغ سے ملئے" جوں جوں سالانہ امتحان کے دن قریب آنے لگے۔ وہ کتابوں کے انبار میں گم رہنے لگا۔ یوینگ کرسچین کالج کا یہ دستور تھا کہ سال اول کے سالانہ امتحان میں جو طالب علم اول آتا اسے GANVIER SCHOLAR سرٹیفیکٹ کے ساتھ سولہ روپے وظیفہ بھی ملتا۔ یہ اسکالر شپ ایک سابق پرنسپل DR. GANVIER کا جاری کردہ تھا۔

سال اول کے سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلا اور مصطفےٰ زیدی (تیغ) نے سارے کالج میں اول پوزیشن حاصل کی۔ وہ جینویر اسکالر تھا۔ اس کا نام کالج ہال کے دروازے کے اوپر بورڈ پر لکھ دیا گیا۔ آج بھی مصطفےٰ حسنین زیدی تیغ کا نام ۸-۱۹۴۷ء کے سال میں لکھا ہوا ہے۔ اسی زمانے میں اسے سروج بالا سرن نام کی ایک ہندو لڑکی سے عشق ہو گیا۔ اٹھتے بیٹھتے "سروج" نام کا ورد کرتا۔ کالج کے ادبی مجلہ میں "مس" کے نام سے اس کی ایک نظم بھی چھپی۔ جیسا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے' تیغ اور سروج

دونوں کے نام ہر لڑکے کی زبان پر اکٹھے آئے۔ باقاعدہ ایک اسکینڈل بن گیا۔ اس عشق نے شاعری کو اور چمکایا۔(۵)

مصطفےٰ زیدی نے خود اس دور کے متعلق لکھا "میں جو شعر لکھتا تھا وہ تیسرے درجے کے فلمی رسالوں میں ڈھائی تین روپے فی نظم کے حساب سے بکا کرتے تھے لیکن جب فراق صاحب نے میرے قطعوں کا مجموعہ "زنجیریں" چھاپنے کا سنجیدہ ارادہ کیا تو مجھے اشعار کا دوبارہ جائزہ لینا پڑا۔ اس زمانے میں میں بنیادی طور پر ہیرو پرستی کا عادی تھا۔ اپنے متعلق صرف یہ خیال تھا کہ شعر لکھنے کی مجھے مشق ضرور ہو گئی ہے لیکن دراصل میں زیادہ سے زیادہ شعر کا ایک اچھا طالب علم ہونے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ اس لئے میں اشعار اور شعراء کو بچوں کی طرح پُوجتا تھا۔ آپ یہ بات دیکھیے کہ میں نے ایک بار چار پانچ ماہ تک اپنے سارے پیسے اس لئے جمع کیے تھے کہ جوش صاحب جنہیں پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا سے ملنے پونا جاؤں گا۔ اس وقت فراق صاحب کے اشعار کی میں زیادہ قدر نہیں کرتا تھا اور الہ آباد میں رہتے ہوئے ان سے اس وقت تک نہیں ملا تھا' جب تک جوش صاحب نے نہیں لکھا تھا"۔

جولائی ۱۹۴۷ء میں مصطفےٰ زیدی کا پہلا مجموعہ "زنجیریں" چھپ کر آگیا۔ اس وقت مصطفےٰ زیدی کی عمر صرف سترہ برس کی تھی۔ مجموعہ "زنجیریں" سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے چھپا جس کا اہتمام فراق گورکھپوری نے کیا تھا۔ پاکٹ سائز کا زرد رنگ کے دبیز کاغذ پر چھپا یہ مجموعہ' قطعات پر مشتمل تھا جو کسی حد تک اختر انصاری کے مجموعے "نغمۂ" سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ کتاب کا انتساب "س" کے نام تھا۔ اندر جنوری ۱۹۴۶ء کی ایک تصویر جو مصطفےٰ زیدی کی تھی کے نیچے ایک شعر درج تھا۔

قدر فرما تیغ کی' اے دخترِ گنگ و جمن
تیغ جو اس وقت ہے پیغمبرِ شعر و سخن

ظاہر ہے کہ اس میں "دخترِ گنگ و جمن" وہی لڑکی سروج تھی۔ کتاب کا مقدمہ فراق گورکھپوری نے لکھا تھا۔ کتاب کا انتساب ملاحظہ ہو:

"س" کے نام

جس کی ہر ہر ادا تھی کالج میں
زندگانی کے خواب کی تعبیر
جس کے چہرے پہ گنگناتی تھی
صبح کی نقرئی حسیں تنویر
جس کے تیور میں بے رخی کی ادا
جس کی آنکھوں میں التفات کے تیر
شگفتگی جیسے جوش کے اشعار
سادگی جس طرح تغزلِ میر
گیسوؤں میں ملاحتِ بنگال
عارضوں میں لطافتِ کشمیر
چال، سب پاپ، جس سے سکتے میں
قلب کھینچی نہ حسرتِ تقریر
نقش ہر ہر شکن میں ساری کے
بھکی بھکی بہار کی تحریر
جس سے بنیادِ عافیت لے کر
زیست کرتی ہے عشق کی تعمیر
ابروؤں کے ہر اک اشارے میں
نعرۂ وصل، نالۂ شب گیر
وہ نگاہوں کے تل پہ رہ رہ کر
دونوں عالم کا جذبۂ تسخیر
شعر و نغمہ کا زیر و بم کہ بدن
جلد کے نرم سادگی کہ حریر
خامشی میں سرور کا عالم
وقتِ گفتار سحر کا تاثیر
جس کا اقرار مرہمِ ناسور

جس کا انکار جوہر شمشیر
جس کے الفاظ میں ترنم ریز
آبشاروں کے بے شمار نفیر
بات کرنے میں لہجہ شیریں
شوخ بے باک موجہ تنویر
جیسے مندر میں جھٹپٹے کے وقت
جلتے دیپک کی جھلملاتی لکیر
ہیچ ہیں اس کے آگے زنجیریں
تیری زلفوں میں جس کا دل ہو اسیر

مصطفےٰ زیدی کا یہ اولین مجموعہ اپنے دل کش موضوعات اور انداز بیان کی نزاکت' کومل' ایمایت' تشبیہات کے انوکھے پن اور نرول تصویر کاری کے سبب دامن دل کو کھینچتا ہے۔

آؤ سو جائیں

کوہ ساروں پہ چھا گیا ہے سکوت
آبشاروں کی آنکھ میں ہے نمی
چاند بھی چھپ گیا ہے بادل میں
آؤ سو جائیں رات بھیگ چلی

کون ؟

گاؤں کے خوشنما دھندلکوں میں
ہو گیا گم ہر اک حسیں سایا
کوئی آواز دے رہا ہے مجھے
ہم نے سایوں میں تم کو دیکھ لیا

جب "زنجیریں" چھپ کر بازار میں آیا تو بقول فراق گورکھپوری ان کے مقدمے

میں مصطفےٰ زیدی نے بہت کچھ اُن کی مرضی کے بغیر اپنی طرف سے بڑھا لیا تھا۔ اس بات پر رنجش پیدا ہوئی جو مدت تک قائم رہی۔

اب وہ زمانہ تھا جب مصطفےٰ زیدی اور اس کے دوستوں نے کمیونسٹ پارٹی میں دل چسپی لینا شروع کی اور خوب لٹریچر پڑھ ڈالا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ مذہب کے خلاف تو وہ پہلے ہی تھا اب اسے یہ بھی پتا چلا کہ مذہب انسان کو روایتوں کا پابند کر کے مردہ بناتا ہے۔ اب اور شدت سے مذہب کی مخالفت شروع کر دی۔ علی سردار جعفری کی کمیونسٹ خیالات کی پرچارک نظم "نئی دنیا کو سلام" کالج کیمپس میں زور زور سے پڑھی اور مذہب کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا جاتا۔ اس زمانے میں مصطفےٰ حسنین تیغ نے بھی ایک نظم "انسان پیدا ہو گیا" لکھی جس کا مصرعہ ہے:

قرآں سے بڑھ کر اب مرے دیواں کی دھوم ہے

یہ نظم مجموعہ "روشنی" بھارتی ایڈیشن میں شامل ہے۔ اس نظم کے چھپنے سے ادبی حلقوں میں وہ ایک بار پھر بحث کا موضوع بنا۔ خوب لے دے ہوئی۔ کچھ لوگ جو اس کے خیالات کے حامی تھے اس کے حق میں بولتے اور کچھ اسے ملحد گردانتے لیکن اسے ان باتوں کی پروا نہیں تھی اور وہ ان دنوں جوش اور مجاز سے بہت متاثر تھا۔ اس لئے کہ یہی باتیں جو اکثر ان بڑے شاعروں کے خلاف ہوتی رہی تھیں وہ اپنے متعلق سن کر خوش ہوا۔ اس کے اپنے خیال میں یہی مخالفت اسے مجاز اور جوش کے قریب لا رہی تھی۔

وہ اپنی ڈگر پر چلتا رہا۔ سب سے پہلے گھر میں مخالفت شروع ہوئی تھی اور بعد میں یہ عالم ہو گیا کہ اس کے خیالات کی مخالفت میں نظمیں لکھی جانے لگیں۔ ایک نظم جو اس کے خلاف لکھی گئی تھی اور خاصی مشہور بھی ہوئی "شیطان پیدا ہو گیا" تھی۔ اس نظم میں اسے "اہرمن عصر نو" کہا گیا تھا لیکن خود اسے جب اس نظم کے بارے میں پتا چلا تو خفا ہونے کی بجائے خوب قہقہے مار کر ہنسا اور بولا "دیکھو مولوی لوگ مجھ سے کیسے پریشان ہیں" پھر جوش کی ایک نظم جو "حرف و حکایات" میں شامل ہے، کی زمین میں ایک اور طویل نظم لکھی۔

ایک شعر دیکھتے چلئے:

وہ خدا جو قلم کا اک جھلملاتا سین ہے
وہ خدا جو آدمی کی ذات کی توہین ہے

اب اسے کبھی کبھار ریڈیو پر بھی پڑھنے کا موقع مل جاتا۔ انہی دنوں کا ایک دل چسپ واقعہ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اپنے مضمون "تیغ الہ آبادی' ایک ہم جماعت ایک دوست" میں بیان کیا ہے۔

"ایک روز جب کالج جانے کا وقت تھا۔ دیکھا تیغ صاحب پیدل دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ خیال ہوا کہ کوئی حادثہ ہوا؟ کیا بات ہوئی' روک کر پوچھنا چاہا مگر انھوں نے جواب نہ دیا۔ تقریباً" تین بجے کالج آئے اور کہنے لگے کہ مجھے لکھنؤ کے لئے جہاز پکڑنا تھا کیوں کہ آج ہی میرا پروگرام ریڈیو پر ہے اس لئے بھاگ رہا تھا تاکہ بمبرولی ہوائی اڈے پر ٹھیک وقت میں پہنچ جاؤں۔ آج شام کو آپ لوگ سنئے گا (حالانکہ ان کی آواز کا ریکارڈ الہ آباد میں پہلے ہی ہو چکا تھا) چنانچہ ہم ان کے ساتھی' شام کو ان کی نظم سننے کے لئے جمع ہوئے۔ واقعی ان کی نظم "نیا آزر" ریڈیو پر انھیں کی آواز میں آرہی تھی۔ خیر ایسی باتیں سب کی زندگی میں ہوتی ہیں۔ ہم سب کسی نہ کسی منزل پر اس کے متمنی ہوتے ہیں کہ لوگ ہمارے کارناموں کا نوٹس لیں"۔

کالج کے دوسرے سال میں سرلا کپور نام کی ایک ہندو لڑکی جس کا تعلق کانپور سے تھا' اس کے دل میں گھر کر گئی۔ سروج سے محبت میں ناکامی ہوئی تھی' اس لئے اور زیادہ شدت سے سرلا کپور کو چاہا۔ اب سرلا کپور پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ دوسرے مجموعہ "روشنی" میں شامل نظم "ایک ہم جماعت خاتون سے" سرلا کپور پر ہی لکھی گئی تھی۔ اسی طرح پریم کمار جین بھی ایک ہم جماعت خوب صورت لڑکا تھا۔ کسی اچھے خاندان کا اور اس میں کسی قدر نسوانیت پائی جاتی تھی۔ تیغ نے اس پر نظمیں لکھیں' کتاب "روشنی" پریم کمار جین کے ہی نام معنون کی گئی تھی۔

سارا سال عشق و محبت اور شاعری کے جھمیلوں میں گزرتا پڑتا مصطفےٰ زیدی امتحانات کے زمانے میں سب کچھ بھلا کر صرف نصاب کا ہو رہتا تھا۔ یوں ایف اے کا امتحان اس نے درجہ اول میں پاس کر لیا' صوبے بھر میں اس کی چھٹی پوزیشن تھی۔ اسکالرشپ ملا اور تھا تھ سے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا گیا۔ یہاں اپنی انفرادیت

قائم رکھنا بڑی بات تھی۔ لیکن وہ چونکہ اپنی شاعری کی وجہ سے ملک گیر شہرت حاصل کر چکا تھا' اس لئے یہاں بھی نمایاں ہی رہا۔ ان دنوں انگلش فراق گورکھپوری اور اردو ڈاکٹر اعجاز حسین پڑھاتے تھے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم پر وہ مغموم تھا' وہ اس کے سخت خلاف تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات نے اس کی شاعری کا رخ موڑ دیا۔ اسی زمانے میں کرشن چندر کا "ہم وحشی ہیں" اور قرۃ العین حیدر کا "میرے بھی صنم خانے" شائع ہوا۔ ہر طرف قتل و غارت اور کشمکش دیکھ کر مصطفےٰ زیدی نے سوال اٹھایا:

ہمارے خون کی حاجت ہو تو یوں ہی کہہ دو
کدھر کا عزم ہے یہ تیوریاں چڑھائے ہوئے
قدم قدم پہ سیاست کی ٹھوکریں کھا کر
نفس نفس میں لہو کی مہک رچائے ہوئے

(قومی مسلمان کا استفسار)

اور جب اس درشت لہجے کو دیکھ کر یار دوست ذرا نرمی سے بات کرنے کا مشورہ دیتے تو وہ جیسے پھٹ پڑتا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا یہ سامراج میرا کیا بگاڑ لے گا؟" ٹھیک ایک سال بعد ۱۹۴۸ء میں اس نے طغرل فرغان کے ساتھ مل کر ایک ماہنامہ "نکہت" الہ آباد سے جاری کیا۔ واضح رہے کہ طغرل فرغان مشہور جاسوسی ناول نگار ابن صفی مرحوم تھے۔

یونیورسٹی میں ایک MARXIST کلب تھا' جس کے قابل ذکر اراکین میں ڈاکٹر اطہر انصاری' آشارام' ڈاکٹر ستیش چندر' پروفیسر ترپاٹھی' پرکاش چندر گپت' قسیم انصاری اور دیوندر اسر شامل تھے۔ MARXIST کلب نے مصطفےٰ زیدی کی نظموں کا باغیانہ لہجہ دیکھ کر ہمت افزائی کی۔ چونکہ اب وہ خود بھی کمیونزم پر بہت کچھ پڑھ چکا تھا اور ذہنی طور پر اس سے متفق بھی تھا اس لئے اپنے دوستوں سمیت اس انجمن میں شامل ہو گیا۔ لیکن یہ انجمن کچھ زیادہ دن نہ چل سکی۔ اس نے اور اس کے انقلابی ساتھیوں نے اپنے خیالات کا پرچار جاری رکھا اور انجمن "حیات نو" قائم کی۔ نشستیں اسلامیہ کالج الہ آباد اور مصطفےٰ زیدی کے گھر پر ہوا کرتیں۔ رفتہ رفتہ انجمن کا بھی

شیرازہ بکھرا تو وہ ایک ادبی رسالہ نکالنے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ رسالے کا نام "کرن" تھا۔ بقول مصطفےٰ زیدی "میں نے الہ آباد سے ایک رسالہ "کرن" نکالنا شروع کیا۔ اس زمانے میں یوں تو ہر جگہ سے بے شمار رسالے نکل رہے تھے۔ لیکن الہ آباد کا یہ حال تھا کہ ہر محلے کے کونے میں ایک رسالہ آ گیا تھا۔ پروفیسر اعجاز صاحب "کارواں" نکال رہے تھے۔ فراق صاحب بھی "دیپک" کے اجراء کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان سب لوگوں کے پاس کافی سرمایہ تھا۔ میں نے "کرن" نکالنے کی نیت کی تو صرف اتنا سرمایہ تھا کہ اس میں کوئی گلی میں خوانچہ لگانے کا بھی خیال نہیں کر سکتا۔ بہرحال "کرن" نکلا اور اس کے دو تین نمبر کامیاب ہوئے اور شاید پرچہ بغیر سرمایہ کے بھی چلتا رہتا لیکن بیچ میں سیاست درمیاں آ گئی۔" (٦)

"کرن" بڑی دھوم دھام سے نکلا تھا اور اس کی دن رات کی محنت نے کرن کو چمکا بھی دیا۔ لیکن سرمایہ کی کمی تھی اور ادبی رسالہ نکالنا یوں بھی جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہ اس کی ہمت تھی کہ اس رسم کو نباہ گیا۔ رسالے میں اشتہار کوئی نہ دیتا تھا اس لئے ساری ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر تھی۔ وہ خود ہی اسے بک اسٹالوں پر تقسیم کرنے لے جایا کرتا تھا۔ پھر یہ پرچہ حکومت نے ضبط کر لیا۔ اس ضبطی کا فوری سبب خصوصیت سے صفی لکھنوی کا قطعہ تھا:

زباں بگڑی ہے بھارت ریڈیو کی
ہنسی آتی ہے جب منہ کھولتا ہے
جہاں پہلے چہکتے تھے عنادل
وہاں افسوس الّو بولتا ہے

۱۹۴۹ء میں مصطفےٰ زیدی کا دوسرا شعری مجموعہ "روشنی" آیا جسے مکتبہ حیات نو الہ آباد نے چھاپا تھا۔ روشنی کا انتساب پریم کمار جین کے نام ان الفاظ میں تھا۔

ترے جمال کو احساسِ درد ہو کہ نہ ہو
بجھے پڑے ہیں ترانے' ستار زخمی ہے
حیات سوگ میں ہے بے زبان دل کی طرح

کہ نوجوان امنگوں کے ہار زخمی ہیں

یہ وہ زمانہ ہے جب مصطفےٰ زیدی (تیغ الہ آبادی) کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ الہ آباد کا کوئی مشاعرہ اس کے بغیر مکمل ہی نہ سمجھا جاتا۔ اس نے نوجوانی کے ایام میں ہی جو حیثیت بنا لی تھی وہ ہر ابھرتے ہوئے فنکار کے لئے باعث رشک تھی۔ وہ ایک خاص گھن گرج کے ساتھ نظمیں پڑھتا اور پورے مجمع پر چھا جاتا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی وجہ شہرت بلہ گلہ اور شور و شغب بھی ہے لیکن اس کی نظمیں ان محفلوں میں بھی سناٹا طاری کر دیتیں ۔ حتیٰ کہ اس کا لباس اس وقت کا ایک فیشن بن گیا۔ کھدر کا کرتا' موٹے فریم کا چشمہ' ایک چپل جو عموماً سفید ہوتی اور اگر سردی کا موسم ہوا تو ایک گرم چادر جو شانوں پر لپٹی رہتی۔ چشموں کی دکانوں پر عموماً لوگ "تیغ" کے حوالے سے اس کے جیسا فریم مانگتے۔ ان دنوں الہ آباد میں مختلف جگہوں پر مشاعرے ہوتے جن میں شرکت کرتا ایم پی ہاؤس' شاہ گنج دائرہ شاہ اجمل' بنگالی کالج اور پھر سر تیج بہادر سپرو اور پروفیسر ضامن علی کے مکان پر ہر سال عظیم الشان مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

جب وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیکرٹری منتخب ہوا ہے تو اس وقت الہ آباد اچھے شعراء کا مرکز بن چکا تھا۔ فراق گورکھپوری' اسرار الحق مجاز' وامق جونپوری' مسعود اختر جمال' مظفر شاہجہاں پوری' نوح ناروی' دل لکھنوی' انور مرزا پوری سب ادبی محفلوں میں موجود رہے۔ نثر نگاروں میں اوپندر ناتھ اشک اور بلونت سنگھ بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے ان اجلاسوں میں پابندی سے آیا کرتے تھے۔

بقول مصطفےٰ زیدی: "جب خوشی خوشی کی طرح اور غم غم کی طرح ہوتا تھا۔ ادب جمالیات' اور جدلیات پر دن رات بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ بحث میں شامل ہونے والے بزرگ بھی تھے' جوان بھی تھے اور دیکھنے والے بھی' فراق گورکھپوری' اپندر ناتھ اشک' بلونت سنگھ' وامق جونپوری' ڈاکٹر اعجاز حسین' پروفیسر مسیح الزماں اور مسعود اختر جمال کے ساتھ ساتھ معصوم رضا راہی' دیوندر اسر اور میں ان نوجوانوں میں سے تھے جو انہیں صحبتوں میں بیٹھتے تھے۔ کبھی بیت بازیاں ہوتی تھیں اور اس شرط کے ساتھ کہ آج صرف غالب' میر' سودا اور انہیں کے کلام سے حصے سنائے جائیں گے یا آج

صرف بلینک ورس کے مصرعے پڑھے جائیں گے۔ جوش ملیح آبادی' ساحر لدھیانوی اور مجاز مرحوم بھی گاہے گاہے الہ آباد آجاتے تھے۔ آئے دن مشاعرہ ہوتا تھا۔ افسانے اور مضامین پڑھے جاتے تھے۔ ادب برائے ادب پر بحث برائے بحث ہوا کرتی تھی۔ چھوٹے موٹے ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ بے ضرر لگاوٹوں سے لیکر خطرناک محبتوں تک کے مراحل طے ہوتے رہتے تھے"(۷)

مصطفٰے زیدی نے سیکرٹری کی حیثیت سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے لئے بڑا کام کیا لیکن اس کی انجمن کے چند بڑے اراکین سے نہ نبھ سکی اور اس نے انجمن سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس میں بھی اس کی حد سے بڑھی ہوئی انا کا دخل زیادہ تھا۔

اس کی عجب طبیعت تھی وہ چاہتا تھا کہ لوگ اس کے متعلق بری بھلی کچھ نہ کچھ باتیں ضرور کرتے رہیں۔ اس کے ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو جانے کے متعلق واصل عثمانی لکھتے ہیں۔ (۸)

"میں ۱۹۳۹ء کے جاڑوں میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس وقت ہمارے کالج مجیدیہ اسلامیہ الہ آباد میں ادبی ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ ہفتہ کے آخری دن ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں مقامی وغیرمقامی شعراء کافی تعداد میں شریک ہوئے۔ جب تیغ الہ آبادی کا نام مشاعرہ میں پکارا گیا تو کتھئی شال کاندھوں پر ڈالے ہوئے ایک متوازن قد کے خوبصورت نوجوان نے مائیکروفون کے سامنے آکے مائیکروفون کو درست کرتے ہوئے کہا "میری نظم کا عنوان ہے "سناتا"۔ کالج کے کچھ شریر طالب علموں نے پچھلی نشستوں سے تیغ کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے جملہ کسا" واہ۔ خاتا" یہ سنتے ہی تیغ مائک پٹک کر واپس جانے لگے۔ سیکرٹری اور رضاکاروں نے خوشامد کر کے انہیں بٹھایا اور انہوں نے پھر کہا "نظم کا عنوان ہے سناتا" اس بار سارے مجمع پر سکوت تھا اور تیغ نے اپنی نظم پڑھنی شروع کی:

تجھ کو معلوم نہیں دوست کہ کتنے آلام
میری افسردہ جوانی کا لہو پیتے ہیں
کتنی ہی یادوں نے راتوں کو ڈسا ہے مجھ کو
کتنے ہی سال مجھے روتے ہوئے بیتے ہیں

[illegible] میں بی اے کا نتیجہ نکلا اور وہ درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں اس کی چھٹی پوزیشن تھی۔ انگلش میں اول آنے پر اسے "پروفیسر ٹین گولڈ میڈل" ملا۔ اس کے انگریزی میں اول پوزیشن حاصل کرنے پر ڈاکٹر [illegible] میڈل اور اقبال گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔ اب اس نے ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ طبیعت کی رنگین مزاجی ابھی تک ویسی قائم تھی۔ شعبہ کی ایک لڑکی سروج سے دوبارہ معاشقہ چل نکلا۔ اس عشق کی وجہ سے پہلے سال امتحان میں اول پوزیشن حاصل نہ کر سکا جس کا اسے شدید قلق تھا۔ بہت دن ملول پھرا کیا۔ دوسرے سال ستمبر میں اس نے اچانک عشق میں ناکامی پر خودکشی کی کوشش کی اس نے کافی مقدار میں افیون کھالی تھی۔ کالون ہسپتال الہ آباد میں داخل کروا دیا گیا۔ موت اور زندگی کی کش مکش میں کافی دن بستر پر پڑا رہا لیکن آخر کار فیصلہ زندگی کے حق ہی میں ہوا۔ تندرست ہونے پر اس نے تعلیمی سلسلہ ختم کر دیا۔ اب صرف مشاعرے، کمیونسٹ پارٹی کے الیکشن اور ادبی مجلسوں میں دلچسپی لینا اس کے مشاغل رہ گئے تھے۔

اسی زمانے میں تیسرا شعری مجموعہ مرتب کیا "دھرتی کے گیت"۔ رسالہ "آجکل" میں اس نے جو اشتہار چھپنے کو بھیجا تھا اس کے مطابق "دھرتی کے گیت" پربھات پبلشرز چوک الہ آباد سے چھپنا تھا۔ بعد میں یہ مجموعہ اس کے پاکستان چلے آنے پر اس نام سے نہ چھپ سکا۔

خودکشی کی کوشش میں ناکام ——— تعلیمی سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ محض اپنے آپ کو بہلانے کی خاطر طرح طرح کے مشاغل اختیار کئے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ سروج ایک سراب تھا جس کی آرزو نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ وہ ایک بڑی کمزوری کا شکار تھا۔ جس چیز کو پسند کرتا اسے حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتا۔ اس کا قول تھا:

سکونِ دل کو ضروری ہے لمس کی لذت
کہانیوں میں کہیں زندگی نہیں ملتی

دنیا نے اسے "بالک ہٹ" کہا لیکن میں اسے "راج ہٹ" کہتا ہوں۔ ایک بے تاج اور بے زمین راجہ کی ضد——جس کی وجہ سے اسے ساری زندگی بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

جیسے تیسے دن گذر رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء کے اواخر میں اچانک ایک روز مجتبیٰ حسنین زیدی (بڑا بھائی) اسے اپنے ساتھ پاکستان لے آئے (پہلے کچھ دن مشرقی پاکستان حال بنگلہ دیش اور اس کے بعد لاہور) اس کی واحد وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ مجتبیٰ صاحب اسے اس طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ارتضیٰ زیدی اس سے قبل لاہور پہنچ چکے تھے۔

وہ جو پاکستان کے متعلق بات کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا' الہ آباد چھوڑ کر پاکستان کیسے چلا آیا۔ یہ کچھ مصطفیٰ زیدی کا دل ہی جانتا تھا۔ یہ سب اس کے بس کی بات نہ تھی۔ دوستوں کو جو خطوط اس نے پاکستان سے لکھے' ان میں اپنی بے بسی کا ذکر کیا اور ہر ایک کو یہی لکھا کہ جب موقع ملا' الہ آباد چلا آئے گا۔ اسے پاکستان میں ایک دن بھی گذارنا محال تھا۔ الہ آباد کی محفلیں' یار دوست اور سب سے بڑھ کر سروج——انہیں کیسے بھلایا جاسکتا تھا۔

لاہور میں وہ چند روز برہان الدین حسن کے ساتھ پاکستان کیسز پریس (بازار حکیماں۔ ٹکسالی) کے بالائی حصے میں رہا۔ برہان الدین حسن کے والد مولانا معوان الدین' روحانی پیشوا تھے۔ مولانا صاحب کے معتقدین کی ایک مختصر جماعت وہیں پہ قیام پذیر تھی۔ احمد علی سید مصطفیٰ زیدی کا ہر طرح خیال رکھتے اور اس کا دھیان بانٹنے کے لئے انار کلی کے بارونق بازار' مال روڈ کے ریستورانوں اور کتابوں کی دکانوں پر لئے پھرتے لیکن کتابوں کی دکانوں سے قیمتی من پسند کتابیں چوری کرنے اور مختلف موضوعات پر بحثیں کرنے کے بعد بھی مصطفیٰ زیدی ساری ساری رات آنسوؤں سے تکیہ بھگوتا اور ہر ہر کروٹ سروج کو پکارتا۔

اس نے خود لکھا ہے:

"۱۹۵۱ء کے اواخر میں پاکستان آیا اور رفتہ رفتہ ہر گذری ہوئی بات ایک یاد اور زخم بن کر رہ گئی۔ میرا اپنا یہ حال تھا کہ زمانے کی رفتار میرے لئے ساکت ہو چکی تھی

اور مجھے نہ آنے والے دن کی خوشی ہوتی تھی نہ گذرے ہوئے دن کا غصہ۔ اگر کسی کا انتظار رہتا تھا تو لکھنؤ سے عظیم کے خط کا"۔ (۹)

یہ زمانہ خالص تصوراتی رومانیت کا تھا۔ اس زمانے میں اس کے لئے "سروج" کائنات کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ کمرے میں چارپائیاں دو تھیں اور سونے والے چار۔ اس لئے فرش پر بستر بچھائے گئے تھے۔ مسعود اشعر اور احمد علی سید خاص طور سے اس کی دل جوئی کرتے، اسے سمجھا بجھا کر سونے کے لئے آمادہ کرتے۔ کبھی سب دوست مل کر اس کی باتیں سنتے اور جب سب پر غنودگی طاری ہونے لگتی تو تیغ کے دل کی گہرائیوں سے ہوک اٹھتی، "سروج" اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ابھی اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگے گا۔ تب سب کی نیند اچٹ ہو جاتی اور ساری رات آنکھوں میں کٹتی۔

نظم "دور کی آواز" ایسی ہی ایک رات کے بے قرار لمحوں میں مکمل ہوئی۔ وہ یہ نظم اپنی گھائل آواز میں دوستوں کو سناتا تو اس کی آواز رندھ جاتی۔ دو شعر دیکھتے چلئے:

مجھ کو آواز دو کہ صبح کی اوس
کیا مجھے اب بھی یاد کرتی ہے
اب بھی میری اداس چوکھٹ پہ
کیا کبھی چاندنی اترتی ہے

پھر اس نے اپنی یہ نظم "نکہت" الہ آباد کو بھیج دی۔ نظم شائع ہوئی تو مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ الہ آباد کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو پوری نظم زبانی یاد ہو گئی۔ وہ عموماً بے قراری میں بے اختیار قطعات بھی کہتا۔ ان ہی جاگتی راتوں میں یہ قطعہ کہا گیا تھا:

وقت کے ساتھ لوگ کہتے تھے
زخم دل بھی تمہارے ہوں گے دور
آج کوئی انہیں خبر کر دو
میرا ہر زخم بن گیا ناسور

سروج کی تصویر اس نے اپنی بیاض میں چھپا رکھی تھی۔ ایک دن مسعود اشعر نے

وہ تصویر چپکے سے دیکھ لی اور احمد علی سید کو بھی دکھائی۔ دونوں اس نتیجہ پر پہنچے کہ:

"FOR SUCH A BEAUTY LET ZAIDI CRY"

انہی دنوں زیدی اپنے چھوٹے بھائی ارتضیٰ اور بھتیجوں کے ساتھ گاندھی پارک میں ایک ہوم پائپ فیکٹری کے دو کمروں میں منتقل ہو گیا' جو ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے تھے۔

دوستوں کو اطمینان ہوا کہ ان کا دوست بہت جلد نئے ماحول میں گھل مل کر سروج کو بھول جائے گا۔

اب احمد علی سید جو کراچی سے آئے ہوئے تھے' واپس چلے گئے۔ مسعود اشعر اور برہان الدین حسن اپنی اپنی پریشانیوں میں الجھ گئے۔ کبھی دوپہر یا شام کو تینوں دوست مل بیٹھتے تو حالات حاضرہ پر بات کرتے۔ نئی کتابیں تلاش کرتے اور کبھی یوں ہی سڑکوں پر نکل کھڑے ہوتے۔ شام کے سائے گہرے ہو جانے پر مصطفےٰ زیدی گاندھی پارک اپنے گھر چلا جاتا اور برہان الدین اور مسعود بھاٹی گیٹ کے اندر بازار حکیماں کا رخ کرتے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل جانے پر مصطفےٰ زیدی' حسب معمول اپنے نصاب پر جٹ گیا اور قطعہ لکھا:

سن کے غیروں کے زہر سے فقرے
دیکھ کر اپنے گھر کی ویرانی
میں بھی جب مسکرا ہی دیتا ہوں
تم تو کتنا بدل گئی ہو گی

اب لاہور کینٹ میں رہنے والے رشتہ دار اور بازار حکیماں کے دوست خوش تھے کہ خطرہ ٹل گیا۔ اب اس نے ایم۔اے فائنل (انگلش) کی تیاری زور شور سے شروع کر دی تھی۔

امتحانات سے محض ایک روز قبل مسعود اشعر سے اس کی ملاقات ہوئی' وہ کچھ چپ چپ تھا۔ پھر اس نے اشعر کو اگلی صبح سات بجے گھر پہ ملنے کو کہا۔ یہ نہیں بتایا کہ کام کیا ہے بس آنے کی تاکید کر دی۔

اگلی صبح گھر میں کہرام مچا ہوا تھا اور زیدی موت و زیست کی کش مکش سے دوچار۔ سروج ایک بار پھر زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کے روپ میں اس کے شعور کی وسعتوں پر چھا گئی تھی' زیدی نے مکرر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ خودکشی کی یہ کوشش بہت بھرپور تھی وہ اب کی بار زندگی کے اگلے پچھلے تمام قرض اتار دینے پر تلا ہوا تھا۔ درجنوں انجکشنوں اور ہسپتال کی نہ ختم ہونے والی طویل راتوں کے بعد اسے ایک بار پھر بچا لیا گیا۔ (۱۰)

اب اس نے ہر حال میں زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس میں بہت واضح تبدیلیاں دیکھی گئیں۔ اس نے انتہائی کمزوری کے باوجود ڈٹ کر امتحان دیا۔ غالباً" یہی وہ موقع تھا جب اس نے ذہنی طور پر تیغ الہ آبادی کو خیر کہہ دیا تھا۔ اگرچہ اس کا اعلان کئی سال بعد کیا۔

اب وہ امن تحریک سے زیادہ وجودیت پر بات کرتا اور پبلو نرودا سے زیادہ جارج سنتیانا کا ذکر کرتا۔ اب اس کی شاعری نے بھی کروٹ لی تھی۔ اس کی آواز کی گھن گرج کم ہو کر عجیب طرح کی بیزاری میں ڈھل گئی۔ پہلے اسے اپنی ذات پر ایک رومانی اعتماد تھا۔

منعم کا تو خدا بھی اہل بت بھی پاسباں
مفلس کے صرف تیغ علیہ السلام ہیں

لیکن اب وہ بہت کچھ حقیقت پسند ہوتا جا رہا تھا اور اس کے اشعار میں ایک تلخی نے پرورش پانی شروع کر دی تھی۔

اتنے ربط' اتنی شناسائی کے بعد
کون کس کے حال کا محرم رہا

اب اس نے اعلان کیا کہ وہ "قائم بالذات" ہو گیا ہے' اور اسے دنیا کی کوئی طاقت گزند نہیں پہنچا سکتی۔ اس کا یہی اعتماد تھا کہ کار کے ایک خطرناک حادثے میں پسلیاں تڑوا لینے کے باوجود زندہ رہا۔ نقاد اور شاعر مظفر علی سید ان دنوں اس کے ہم جماعت تھے اور دونوں اول آنے کے لئے کوشاں۔ زیدی سال پنجم کا امتحان الہ آباد

یونیورسٹی سے پاس کر چکا تھا اور اب اس نے محض چھٹے سال کے پرچے دیئے تھے۔
۱۹۵۳ء میں جب نتیجہ نکلا تو پتا چلا کہ وہ یونیورسٹی بھر میں اول رہا ہے۔ اول آنے کی یہ
دوڑ وہ مظفر علی سید سے جیت چکا تھا۔ اس فتح میں مصطفےٰ زیدی کی محنت کو تو دخل تھا
ہی لیکن الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کردہ نمبر خاص طور پر کام آئے۔

اب مصطفےٰ زیدی نے پوری ہوشمندی کے ساتھ سنبھل سنبھل کر عملی زندگی میں قدم رکھا لیکن اس گھناؤنے معاشرے نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہمیشہ سے ذہین افراد کا مقدر رہا ہے۔ وہ جو کچھ بننا چاہتا تھا بالکل اس کے برعکس بنتا چلا گیا۔ وہ مجبور تھا' اور حالات کا دھارا بہت تیز۔ اس نے انگلش میں ریسرچ شروع کی اور چھوڑ دی۔ پھر وہ اپنے ذہن میں ایک کامیاب زندگی کرنے کا دھندلا سا خاکہ لئے کراچی چلا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ کراچی میں بے کاری کا زمانہ تھا' وہ اپنے دوست احمد علی سید کے ہاں ٹھہرا۔ ان دنوں اس نے دوستوں کے ساتھ سڑکوں پر ٹہل ٹہل کر اپنی چند اچھی نظمیں اور غزلیں مکمل کیں "گرب اسٹریٹ کی کہانی" بھی راستہ چلتے' دوستوں سے فقرہ بازی کرتے موزوں کی گئی تھی۔ اس طرح ایک رات وہ اور احمد علی سید' خواجہ احمد عباس کی ہندی فلم "انہونی" کا آخری شو دیکھ کر واپس آ رہے تھے کہ نظم "برف باری" کا پہلا شعر ہوا۔

کون سنتا اس بھیانک رات میں دل کی پکار
میرے ہونٹوں پر مری فریاد جم کر رہ گئی

رات کہر آلود تھی اور خلاف معمول سخت سردی پڑ رہی تھی۔

دونوں اس شعر کو گنگناتے گھر پہنچے۔ سید صاحب کھانا کھا کر سو گئے لیکن جب تین ساڑھے تین بجے اچانک ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ زیدی کمرے میں رقص کے انداز میں دائرے بنا رہا ہے۔ پوچھا "یا وحشت کیا ماجرا ہے؟" جواب ملا۔ نظم مکمل ہو گئی ہے۔

تم نے شاید یہ نہیں سوچا کہ میری روح میں

اک اجنتا گر گیا' پتھر کے ٹکڑے رہ گئے
کتنی نظموں کے لبوں پر پپڑیاں سی جم گئیں
کتنے افسانے خس و خاشاک بن کر رہ گئے
کتنے گیتوں کا تصور جم گیا مضراب میں
کتنے بت آورش کے اندھے کھنڈر میں رہ گئے

یہ نظم احمد علی سید کو اتنی پسند آئی کہ باقی رات رت جگا منایا گیا۔ (۱)

کچھ مدت بعد وہ ابی سینا لائنز کے خیمہ نمبر جے ۴۰ میں اپنے بڑے بھائی عابد رضا کے پاس منتقل ہو گیا۔ ایک رات خوب بارش ہوئی۔ اس کی تمام کتابیں اور کپڑے بھیگ گئے۔ کچھ سامان پانی میں بہہ گیا' صبح احمد علی سید خیریت دریافت کرنے پہنچے تو وہ تہمد باندھے' بھیگا ہوا کپڑے نچوڑ رہا تھا' احمد علی سید کو دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا:

ابھی امنگ میں تھوڑا سا خون باقی ہے
نچوڑ لے غمِ دنیا' نچوڑ لے غمِ دل

کچھ دنوں بعد بطور لیکچرر اسلامیہ کالج کراچی میں ملازمت مل گئی۔

ناول نگار ابن صفی ۱۹۵۲ء میں پاکستان آئے تھے۔ کراچی آنے پر انھیں پتا چلا کہ ان کا پرانا دوست مصطفےٰ حسنین تیغ' اسلامیہ کالج میں پڑھا رہا ہے۔ اسلامیہ کالج گئے لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک صاحب کے پاس اپنا پتا چھوڑ آئے۔

ابن صفی لکھتے ہیں:

"دوسرے دن وہ مجھے تلاش کرتا ہوا لالو کھیت پہنچا۔ بڑی شرمندگی ہوئی۔ شرمندگی کی وجہ بھی اس نے بھانپ لی اور مجھ سے بغلگیر ہوا۔ بولا "خدا کا شکر ادا کرو کہ تمھیں دیواریں نصیب ہوئی ہیں' چھت کے نیچے رات گزارتے ہو ——— نہیں' میں جھینوں کا نہیں ——— تمھیں لینے آیا ہوں ——— میرے ساتھ چلو"۔

میں نے کہا "چائے تو پی لو ——— تمھیں میرے گھر کی چائے پسند تھی ——— کم از کم چائے کا معیار یہاں بھی برقرار ہے"۔

یہ ایک نہ مانا اور مجھے ابی سینا لائین لے گیا۔ اس کا قیام ایک خیمے میں تھا' اب

میں سمجھا کہ اس نے دیواروں پر خدا کا شکر ادا کرنے کا مشورہ کیوں دیا تھا"۔(۳)

مصطفےٰ زیدی کو اسلامیہ کالج کراچی کا ماحول راس نہ آیا۔ وہ طالب علموں کے ساتھ بنا کر نہ رکھ سکا۔ لڑائیاں لڑیں اور طرح طرح کی باتیں سنیں۔ پریشانی اور جھلاہٹ میں مرحوم پرنسپل اے۔ام مولوی کی شان میں ہجو لکھی۔

کارواں　　　　درکارواں　　　　ہے　　　　مولوی

آخر کار اسلامیہ کالج کے ماحول سے جی اچاٹ ہو گیا۔ استعفےٰ دیا اور بھائی عابد رضا کے گھر بیٹھ رہا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب شدید جنسی تقاضوں کی تیز دھار پر چلتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو اپنے بڑے بھائی عابد رضا اور ان کے اہل خانہ سے کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ ایک بڑا سانحہ تھا۔ لیکن جنسی نفسیات کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اب کراچی میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد (ستمبر ۱۹۵۳ء) پشاور یونیورسٹی اسلامیہ کالج کے شعبہ انگلش میں اسے جگہ مل گئی۔ یہاں کا قیام بہت مختصر ہے۔ ۲ جون ۱۹۵۴ء کو کالج چھوڑنا پڑا۔ اس زمانے میں امریکہ سے پاکستان کی یونیورسٹیوں میں مختلف اساتذہ (جن میں خواتین کی معقول تعداد تھی) چلے آرہے تھے۔ زیدی کی بدقسمتی کہ اسی کے شعبہ میں ایک خوب صورت امریکن خاتون پروفیسر پہلے سے موجود تھی اور مصطفےٰ زیدی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور' وہ خاتون اس قبیل سے تھی نہیں جس کا اندازہ زیدی نے لگایا تھا۔ "پیش دستی" مہنگی پڑی نتیجہ کے طور پر یونیورسٹی چھوڑنا پڑی۔ یاد رہے کہ یہ وہی خاتون تھی جس کی چاہ میں بقول مصطفےٰ زیدی' مسعود الروف سی ایس پی بھی پریشان حال رہے۔

اس تمام عرصے میں بڑے بھائی مجتبیٰ زیدی' سول سروس کے امتحان میں بیٹھنے کے لئے زور دیتے رہے تھے۔ مصطفےٰ زیدی کو یورپ جانے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی تو ناچار ۱۹۵۴ء میں پاکستان سول سروس کا امتحان دیا اور غیر متوقع طور پر کامیابی بھی حاصل ہو گئی۔ یہ سارا کام ہنسی مذاق میں ہوا۔ اس کی روداد مسعود اشعر سے سنیئے:

"سول سروس کا امتحان دینے کا بھی بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ یار لوگ تو اس کے لئے دن رات اپنے جسم کا تیل جلا کر تیاری کرتے ہیں اور برسوں اس کے لئے محنت

میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن مصطفےٰ زیدی نے اگر اس کے لیے کوئی تیاری کی تھی تو صرف اتنی کہ امتحان کے دوران ہر روز دوپہر کو پابندی کے ساتھ چنوز لنچ ہوم میں مغز کھایا کرتا تھا۔ ہماری ملاقات روزانہ دوپہر کو یونیورسٹی کے باہر ہوا کرتی تھی۔ زیدی صاحب پرچہ کر کے باہر نکلتے اور لنچ ہوم پہنچ کر مغز کا آرڈر دے دیتے۔ اپنے پرچے کے بارے میں وہ بات کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے' دنیا جہان کی باتیں کرتے لیکن پرچے کی بات بالکل نہیں۔(۳)

اس زمانے میں مصطفےٰ زیدی نے سول سروس اکیڈمی کے بارے میں ایک طنزیہ مضمون "پاگل خانہ" لکھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جو کچھ وہ حاصل کرنا چاہتا ہے شاید اس ملازمت ہی میں اسے مل جائے۔ لیکن وہ حاصل کیا کرنا چاہتا تھا' جستجو کیا تھی۔ اس کی وضاحت وہ خود بھی نہ کر سکا۔

سول سروس کی تربیت کے دوران ۱۹۵۵ء (کومیلا۔ مشرقی پاکستان) میں قیام رہا۔ مصطفےٰ زیدی' جو کبھی تیغ الہ آبادی تھا۔۔۔جو درویشانہ مسلک رکھتا تھا' پرجوش انقلابی مشہور تھا۔ جو گیا رنگ کا کھدر پہنتا تھا۔ عوام کی بالادستی' عوامی راج اور عام انسان کی خوش حالی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ جب اچانک سی ایس پی افسر بنا ہے تو اس کی وضع قطع بھی بدل گئی۔ البتہ اس کا طرز احساس اور وہ فکری رجحانات نہ بدلے۔ جنہیں حالات کی تلخیوں اور مصائب کی بھٹی میں کندن بن کر نکلنے کے بعد اس نے بھینچ کر سینے سے لگایا تھا۔

معاشرے کا یہ بااختیار فرد جب کبھی اپنے پرانے رفیقوں اور دوستوں سے ملتا تو خوشی محسوس کرتا۔ اس کے مزاج میں افسر شاہی کی رعونت اور فرعونیت نہیں آئی۔ اسے دوستوں کی حاجت روائی کر کے بے پایاں مسرت حاصل ہوتی۔ بعض اوقات وہ دوستی میں قانون کی حدود بھی پھلانگ گیا۔ عقل کہتی' مصطفےٰ زیدی' تو سی ایس پی افسر ہے' افسری کر رہا(ے) دنیاوی فلاح اسی میں ہے۔ عیش و طرب کی محفلیں ہیں' عزت ہے' دبدبہ ہے۔ لیکن اس کے اندر کا تیغ الہ آبادی دفتری تکلفات میں اپنا دم گھٹتا محسوس کرتا۔ اس کے ہاں عقل اور دل کی کش مکش تادم مرگ جاری رہی۔

میکدہ کیسے چھوڑ دوں دفتر کے واسطے
دستار کیسے پھینک دوں ٹھوکر کے واسطے

○

جس دن سے اپنا طرزِ فقیرانہ چھٹ گیا
شاہی تو مل گئی' دلِ شاہانہ چھٹ گیا

۱۹۵۶ء میں مصطفےٰ زیدی تربیت مکمل ہو جانے پر بطور اسسٹنٹ کمشنر' سیالکوٹ پہنچا۔ ۱۹۵۶ء میں ہی کولمبو پلان کے تحت اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں لندن تک کا سفر کیا۔ لندن میں قیام سے متعلق مصطفےٰ زیدی نے بتایا:

"تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پچیس آدمیوں کا مختصر لیکن مختلف النوع قافلہ جب لندن پہنچا تو کسی کا کچھ ردعمل ہوا' اور کسی کا کچھ تھا" ایک صاحب نے بی بی سی کے انٹرویو میں اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ "جناب ہم تو مجبور ہیں جو یہاں آکر ہم کو دیکھنا پڑ رہا ہے کہ "بے نقاب عورتیں نامحرم مردوں کے ساتھ شاہراہ عام پر گھومتی پھرتی ہیں"۔

"اس بیان کا اگر اس لطیفے سے مقابلہ کیجئے کہ "صاحب لندن میں جو بات مجھے سب سے زیادہ عجیب معلوم ہوئی ہے' وہ یہ کہ یہاں کہ بچہ بچہ انگریزی بولتا ہے" تو لطیفہ ہیچ معلوم ہو گا۔ بس ایک ہم تھے اور ایک ارشاد بھائی جن کو بے نقاب عورتوں کا نامحرم مردوں کے ساتھ گھومنا معیوب نہیں معلوم ہوا' اور اس پر دلی دلی زبان سے لندن میں یہ شعر ہوا تھا:

کچھ لوگ ایک گلاس بیئر میں بہک گئے
ہم وہ ستم ظریف ہیں وسکی چڑھی نہ رم

"اس طرح کے بہت سے شعر بہت سی غزلیں اور بہت سی نظمیں لکھنے کے مواقع آئے بیشتر ایسے اشعار ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتے ہیں اور کبھی نہیں چھپ سکتے اس لئے لکھنے والے نے چاہے کتنے ہی خلوص سے اور کتنے ہی غیر جذباتی طریقے سے کیوں

نہ لکھا ہو۔ جس کسی کو ان اشعار میں اپنی صورت نظر آتی ہے وہ خفا ہوتا ہے۔ آیئنے کو سیاہ اور مزاج کو تحقیر سمجھتا ہے کہ انداز دلبری یہی ہے۔" (۱۴)

لندن میں قیام کے دوران مصطفےٰ زیدی کی ملاقات ویرا فان مل سے ہوئی یہ جرمن دوشیزہ لندن میں ان دنوں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ انہی دنوں مصطفےٰ زیدی نے دل میں ٹھان لی کہ شادی ویرا ہی سے کرنی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دنوں سروج بالا سرن (پہلی محبت) آکسفورڈ کی طالبہ تھی۔

ویرا فان مل ۱۹۳۷ء میں موشی ایسٹ افریقہ میں پیدا ہوئیں۔ ٹانگانیکا جب برطانوی مقبوضہ علاقہ تھا' اس وقت ان کے والد وہاں مقیم تھے۔ ان کے کافی کے کھیت تھے اور فورڈ ایجنسی میں حصہ دار' ویرا کی والدہ آسٹروی یوگوسلاوی تھیں۔ ویرا نے محنت سے اردو سیکھی بعد میں یونیورسٹی اورینٹل کالج نے اردو میں ڈپلومہ بھی لیا۔

مصطفےٰ زیدی نے لکھا ہے کہ: "۱۵ مئی ۱۹۵۶ء کو میں نے اپنا اگلا پچھلا اثاثہ جوڑ کر اور تمام ہندسوں کی تفریق کو پورا ہندسہ سمجھ کر فورڈ کمپنی سے ایک چھوٹی سی دس ہارس پاور کی "پریفیکٹ" خرید لی۔ چنانچہ اس مجموعے میں جو غزل یوں ہے کہ:

کوئی رفیق بہم ہی نہ ہو تو کیا کیجے
کبھی کبھی ترا غم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

اس میں اس وقت یہ شعر بھی ہوا کرتا تھا:

زخارِ کسں پہ مرنے کو ہم بھی مرتے ہیں
گرہ میں دام و درم ہی نہ ہو تو کیا کیجے (۱۵)

کار خریدنے کے بعد منصوبہ یہ بنا کہ واپسی پر یورپ اور مشرق وسطیٰ کا سفر اسی پر کیا جائے' ارشاد نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا' جب اگست میں چلنے کا وقت آیا تو ایک اور رفیق سفر فتح خان بندیال (۱۶) بھی ساتھ ہو گئے۔ یہ لوگ لندن سے ۱۳ اگست ۱۹۵۶ء کو کار کے ذریعے پاکستان کے لئے نکلے۔ راستے میں مشرقی فرانس' بلجیم' ہالینڈ' جرمنی' آسٹریلیا' جنوبی فرانس' مانٹے کارلو' سوئزرلینڈ اور اٹلی ہوتے ہوئے ستر ہزار میل کی مسافت طے کر کے پاکستان پہنچے۔

مصطفےٰ زیدی' ارشاد اور فتح خان بندیال نے جو طویل سفر کیا اس کا جغرافیہ یہ تھا۔
انگلستان' فرانس (ڈاور۔کیلے۔امیس۔پیرس۔ایمز) بلجیم' ہالینڈ' جرمنی (کولون'
فرینکفرٹ' میونخ) سوئزرلینڈ' دوبارہ فرانس (جنوبی سمت' مانٹے کارلو) اٹلی (میلان'
جینوا' فلورنس' روم' وینس) یوگوسلاویہ (ٹریسٹ' زغرب' بلغرو) یونان (ایتھنز' تھسلونیکا)
ترکی (استنبول' انقرہ) مصر' لبنان (بیروت' دمشق) اردن' عراق' فارس (زیارتین)
پاکستان (کوئٹہ)

فتح خان بندیال بغداد تک مصطفےٰ زیدی اور ارشاد کا ساتھ دے سکے۔ پھر ان سے
الگ ہو کر B.O.A.C کے ذریعے کراچی پہنچے۔ سفر کو انتہا تک پہنچانے کا سہرا ارشاد اور
مصطفےٰ زیدی کے سر رہا "موج مری صدف صدف" اسی مسافت کی پر اثر جذباتی
روداد ہے۔

جرمنی:

آگ کے دشت پڑے خون کے صحرا آئے
اب بھی لیکن وہی افتاد جواں ہے کہ جو تھی
میونخ اب بھی ہے ہر اک عہد کا روشن وارث
ہائیڈ لبرگ وہ حکمت کی دکان ہے کہ جو تھی

ڈوور:

نگر نگر کے خواب میں گم ہیں ڈوور کے ملاح
میں ان خوابوں کے مبہم سناٹے سے آگاہ
اونچی لہریں' بڑھتا دریا' نیچی شہر پناہ

مصر:

سوئز اپنے ساحلوں کے درمیاں ایسے بہہ رہی تھی جیسے کوئی اپنے حسن کا وقار جانتے ہوئے قدم
اٹھائے ادب سے اک قطار میں جہاز ایسے بڑھ رہے تھے جیسے کوئی بھکشوؤں کا قافلہ کپھا میں جائے
فرنگیوں کے چہرے یوں اجڑ گئے تھے جیسے کوئی اک قدم کے فاصلے پہ موت سے نظر ملائے

سیالکوٹ واپسی پر' ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء۔۔۔۔۔۔ مصطفےٰ زیدی نے ویرا فان مل سے
شادی کر لی۔ رسم نکاح علاؤ الدین' ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے ہاں ادا ہوئی۔ شادی سے

چند روز قبل مصطفیٰ زیدی کے بڑے بھائی مجتبیٰ کار کے حادثے میں مشہد (ایران) کے قریب انتقال کر گئے۔ مصطفیٰ زیدی نے ان کی اس ناوقت موت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ شمار کیا:

تم کہاں ہو اے ہم سے بچھڑنے والو
ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں
ماں کی ویران نگاہوں کی طرف دیکھو گے
بھائی آواز اگر دے تو سنو گے کہ نہیں

دشتِ غربت کے بھلے دن سے بھی جی ڈرتا ہے
کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہو گا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے
تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہو گا

۲۲ اگست ۱۹۵۸ء سیالکوٹ میں ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا' جس کا نام مرحوم بھائی کے نام پر رکھا۔(۱۷) اگست ۱۹۵۷ء میں ڈیرہ غازی خان اور فورٹ منرو کے مقامات پر پولیٹکل ایجنٹ کے طور پر قیام رہا۔ ڈیرہ غازی خان کے قیام کے دوران گھوڑوں اور مویشیوں کی نمائش کے موقع پر کل پاکستان مشاعرے کے ساتھ ساتھ مصطفیٰ زیدی کو ڈراما اسٹیج کرنے کی سوجھی۔ اس زمانے میں علی احمد' الحمراء لاہور کے اسٹیج پر مولیئر کا مشہور ڈراما "ذاتِ شریف" پیش کر رہے تھے۔ انھیں ڈیرہ غازی خان آنے کی دعوت دی گئی۔ جملہ آرٹسٹ ایک بس کے ذریعے ڈیرہ پہنچے لیکن اسی شام واپس ہو لئے' پتا چلا کہ ڈیرہ کے لوگ ڈرامائی پروگرام نہ دیکھنا چاہتے تھے لہٰذا ڈراما کمپنی کی وہاں ایک نہ چلی۔

۱۹۵۹ء لیہ میں بطور سب ڈویژنل مجسٹریٹ ایک عظیم الشان مشاعرہ ترتیب دیا جس میں جوش ملیح آبادی نے بھی شرکت کی۔ مشاعرہ بغیر چھت کے سینما ہال میں شروع ہوا۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ اس سے قبل لیہ جیسے دور افتادہ چھوٹے شہر میں

ایسا بڑا مشاعرہ دیکھنے سننے میں نہ آیا تھا۔ ایک سے ایک اچھا شاعر اسٹیج پر آیا لیکن حاضرین کی طرف سے نہ "آہ" تھی نہ "واہ"۔ حضرت جوش ملیح آبادی سے نہ رہا گیا اور مائیکروفون پر آکر چوٹ کی: "بھائی کچھ تو بولو' کہیں ایس ڈی ایم صاحب نے خاموش رہنے کے لئے دفعہ ۱۴۴ تو نہیں لگا دی؟"

جوش کے اس اقدام سے مشاعرے میں جان پڑ گئی۔ یاد رہے کہ اس مشاعرے میں جوش کے علاوہ عبدالحمید عدم' ظہیر کاشمیری اور ناصر کاظمی جیسے شعراء نے شرکت فرمائی تھی۔

لیہ میں صرف آٹھ ماہ قیام رہا اس کے بعد خانیوال تبادلہ ہو گیا۔ اب تک تیسرا شعری مجموعہ "شہر آزر" چھپ کر آچکا تھا۔ خانیوال آب و ہوا کے لحاظ سے اتنی اچھی جگہ نہ تھی۔ چنانچہ کمشنر زبیری کی کوششوں سے مصطفےٰ زیدی کا تبادلہ کوہ مری ہو گیا۔ یہ ۱۹۵۹ء کا آخر تھا۔

جنوری ۱۹۶۰ء میں بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام عصمت رکھا۔ جسے پیار سے عصی پکارتے تھے۔ اپریل ۱۹۶۰ء میں ڈپٹی سیکرٹری تعلیم کے عہدے پر ترقی ملی۔ کوہ مری سے لاہور منتقل ہونے سے قبل "موج مری صدت صدف" شائع ہو چکی تھی۔ ان کے ایک خط سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"ڈپٹی سیکرٹری مقدور تھا' سو پورا ہوا۔ چونکہ "موج مری صدف صدف" کی اشاعت کی اجازت حکومت سے مانگی تھی' سو حکومت نے یہ طے کر کے کہ ہمارا فرزند از حد لائق ہے' شعبہ تعلیم میرے حوالے کر دیا۔ اب دیکھنا میں کیا رنگ دکھاتا ہوں۔ خدا کی قسم پنجاب اور پشاور کو آکسفورڈ اور کیمبرج بنا دوں گا۔ "تنودان" کی جگہ "آگ کا دریا" بہے گا۔"

(مکتوب بنام مسعود اشعر سے اقتباس)

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دسمبر ۱۹۶۰ء میں بطور ڈپٹی کمشنر' جہلم تبادلہ ہوگیا۔ جہلم میں قیام کے دوران میں اس نے اپنی جدت طبع کا مظاہرہ "شب تاب" کے نام سے ایک ادبی مجلہ نکال کر کیا۔

اپریل ۱۹۶۱ء میں بطور ڈپٹی کمشنر' نواب شاہ (سندھ) تبادلہ ہوگیا۔ اسی زمانے میں پانچواں شعری مجموعہ "گریبان" شائع ہوا۔ مصطفےٰ زیدی کے نواب شاہ آجانے پر سندھ کی ادبی سرگرمیوں کی نئے سرے سے تاسیس ہوئی۔ ادارہ مصنفین پاکستان کی ذیلی شاخ' نواب شاہ کے زیر اہتمام مصطفےٰ زیدی کی سرپرستی میں ۲۳ اور ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کو بابائے اردو "ڈاکٹر مولوی عبدالحق" کی یاد میں تاریخی کنونشن ہوا اور نواب شاہ میں ڈاکٹر عبدالحق لائبریری قائم کردی گئی۔

مصطفےٰ زیدی نے یہاں بھی ایک کل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا' جس میں جوش ملیح آبادی' قمر جلالوی' فیض احمد فیض' احمد ندیم قاسمی' احسان دانش اور عبدالحمید عدم جیسے شعراء نے شرکت کی۔ ۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء کو میرپور خاص میں مصطفےٰ زیدی کی کوششوں کے طفیل "جشن جوش" منایا گیا۔

جولائی ۱۹۶۳ء میں بطور ڈپٹی کمشنر' خیرپور میرس (سندھ) تبادلہ ہوگیا۔ اسی زمانے میں "جشن مہران" کے موقع پر مصطفےٰ زیدی نے سکھر میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا اہتمام کیا' جس میں جوش ملیح آبادی' فیض احمد فیض اور ظہیر کاشمیری کے علاوہ پاکستان کے بڑے شعراء نے شرکت کی۔

۱۹۶۳ء میں ساہیوال آگئے' جہاں جوش اور فیض کے ساتھ شامیں منائیں اور ڈسٹرکٹ کونسل کے پرچے "منٹگمری گزٹ" کے لئے "فردا" نام تجویز کرکے اسے اچھا خاصا ادبی پرچہ بنا دیا۔ "فردا" ۱۹۶۹ء تک برابر شائع ہوتا رہا۔

ساہیوال میں قیام کے دوران ہی چھٹا شعری مجموعہ "قبائے ساز" شائع ہوا۔ انہی دنوں میں بہادر نگر فارم سے واپسی پر مصطفےٰ زیدی کو کار کا حادثہ پیش آیا' جس میں اس کی دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ مصطفےٰ زیدی کے ساتھ کار کی اگلی نشست پر حمید احمد قریشی سی ایس پی تشریف رکھتے تھے۔ ان کا ایک دانت اور پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کا بازو ٹوٹ گیا۔ جبکہ ان کے شریک سفر پروفیسر صلاح الدین کو خراش تک نہ

آئی۔ دوسری کاریں بہت پیچھے تھیں۔ مصطفےٰ زیدی نے خود شدید زخمی ہونے کے باوجود اپنے زخمی ساتھیوں کو گاڑی سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ جب تک دیگر کاریں بھی آ پہنچیں' اور جملہ زخمیوں کو ساہیوال ہسپتال منتقل کیا گیا۔

یاد رہے کہ اس سے قبل ۱۹۶۴ء کے اوائل میں علی پور کے قریب سرکاری دورے سے واپسی پر' رات کی تاریکی میں ڈاکوؤں نے مصطفےٰ زیدی کی کار پر حملہ کر دیا تھا۔ اس موقع پر بھی مصطفےٰ زیدی کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔

۱۹۶۵ء کے آخر میں بطور ڈپٹی کمشنر لاہور تبادلہ ہوا' لیکن وہ یہاں خوش نہیں تھا۔

۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء کے ایک خط بنام صہبا اختر سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"لاہور میں جتنی اذیت ناک زندگی گزار رہا ہوں' اس کے عشرِ عشیر کا بھی بیان نہیں کر سکتا۔ دس بیس دنوں میں اپنے واسطے دس بیس منٹ نکالنے بھی ناممکن ہوتے ہیں۔ کام طوفان اور جنون کی طرح سر پر سوار رہتا ہے اور کام بھی اپنا نہیں' دوسروں کا' خود اپنے دفتر ایک دن بھی آرام سے بیٹھ کر کام کرنا نصیب نہ ہوا۔ شعر و شاعری کی فراغت تو کہاں۔ میری ذات میں بنیادی تبدیلی کوئی نہیں ہوئی' میں وہی فقیرِ راہ ہوں کہ جو تھا۔ لیکن بازار کی بھیڑ میں گم ہو گیا ہوں۔ دھکے کھا رہا ہوں۔"

یہ عدیم الفرصتی کے دن ۱۹۶۸ء تک رہے۔ ۱۹۶۸ء میں حکومت پاکستان نے اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں تمغۂ قائد اعظم سے نوازا۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں Nuffield Foundation کے وظیفہ پر تربیت کے لئے لندن تک کا دوبارہ سفر کیا۔ اس بار اپنے ساتھ ویرا اور بچوں کو بھی لے لیا تھا۔ تہران۔ مشہد۔ بیروت۔ دمشق۔ قاہرہ۔ روم۔ ایتھنز۔ زیورچ۔ میونخ اور ہمبرگ سے ہوتے ہوئے ۱۵ اپریل کی سہ پہر لندن پہنچے۔ پرنس البرٹ روڈ (N.W.D) لندن ۱۲ نمبر بلڈنگ کے چار نمبر فلیٹ میں رہائش رہی۔ انہی دنوں میں لکھے ایک خط سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس فلیٹ میں بہت سی خوبیاں ہیں اور چند عیب بھی۔ عیب یہ ہیں کہ یہاں لفٹ نہیں ہے اور ساٹھ تنگ سیڑھیاں اس تک پہنچنے کے لئے عبور کرنی پڑتی ہیں۔ چونکہ یہ فلیٹ مکان میں سب سے اوپر ہے' اس لئے قدیم عمارتوں کی طرح آدھا

ترچھا ہے۔ ادھر کمرے میں کئی کئی کونے نکلے ہوئے ہیں اور دو دو تین تین جگہوں پر چھتیں مختلف تکونوں اور زاویوں میں جھکی ہوئی ہیں۔ ایک ڈرائنگ روم' ایک ڈائننگ روم' ایک باورچی خانہ ایک باتھ روم اور تین بیڈ روم اس میں ہیں۔

جن لوگوں کے کورس پر میں آیا ہوں' ان ہی کا یہ فلیٹ ہے اور لندن کے بالکل وسط میں ہے۔ اس علاقے میں ایسے فلیٹوں کا کرایہ ہمارے کرائے سے کم از کم تین گنا ہے' اس لئے ہم لوگ بہت مطمئن ہیں۔ ابھی تک کام بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ اسکول وغیرہ بند ہیں' ۲۹ کو کھلیں گے۔ تب بچوں کو آسانی سے داخلہ' نزدیک ہی کے ایک اسکول میں مل جائے گا۔"

ایک اور خط سے اقتباس دیکھئے:

"اب ہمارے کورس کا حال سنیے۔ یہاں پہنچ کر NUFFILD والوں کا ایک خط پاکستان سے REDIRECT کیا ہوا ہمیں ملا کہ ہمارے موضوع کے لئے یہاں کوئی Facilities نہیں ہیں اور ہم یا تو اپنا آنا ملتوی کر دیں یا موضوع بدل دیں۔ ہم نے دونوں سے انکار کر دیا اور ہمیشہ کی طرح اپنی ضد پر قائم رہے۔ ابھی تک ادھر ادھر ٹکریں مارتے پھر رہے ہیں اور اپنی WITS پر زندہ ہیں البتہ ۲۷ مئی سے ڈیڑھ مہینے B.B.C والوں کے ساتھ صبح سے شام تک بیٹھے رہنا پڑے گا"

کورس مکمل کر کے ۱۹۶۸ء میں سان فرانسسکو' لاس اینجلز' ہونالولو' ٹوکیو' سائیگان' سنگاپور' بینکاک اور ڈھاکہ سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ یہاں بطور سیکرٹری بنیادی جمہوریت مغربی پاکستان پوسٹنگ کے احکامات ملے۔ یہ آخری منصب تھا۔

لاہور ہی میں نومبر ۱۹۶۹ء کی ایک شام فلائنگ کلب لاہور کا ایک چھوٹا ہوائی جہاز اڑاتے ہوئے حادثہ پیش آیا۔ یہ اندھیرے میں ایک نامعلوم اور غیر محفوظ مقام پر اترنے کا نتیجہ تھا۔ جہاز کو نقصان پہنچا لیکن اتفاق کہیے کہ مصطفےٰ زیدی بال بال بچ گیا۔

۳ دسمبر ۱۹۶۹ء کو ملازمت سے معطل کر دیا گیا اور مئی ۱۹۷۰ء میں برطرف۔ مصطفےٰ زیدی کا نام ۳۰۳ بدعنوان افسروں کی فہرست میں شامل تھا۔

اپنے ایک دوست کو ۱۲ دسمبر ۱۹۶۹ء کے ایک خط میں (جو ۱۴ کالف روڈ سے لکھا گیا تھا) مصطفےٰ زیدی نے ملازمت سے برطرفی کی روداد لکھی ہے:

"مختصرا" یہ کہ جس محکمے کا میں سیکریٹری تھا' اس محکمے میں Public Health کا شعبہ بھی شامل تھا۔ ۲۴ اپریل کی صبح کو ایک ——— نام جناب ناصرام خان میرے دفتر میں آئے۔ ان دنوں یہ ہو رہا تھا کہ جو لوگ ۳ سال سے زاید ایک جگہ رہ چکے ہیں انھیں وہاں سے تبدیل کر دیا جائے۔ ناصرام خان صاحب چاہتے تھے کہ اس اصول کے باوجود انہیں لاہور ہی رہنے دیا جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ REPRESENTATION دے دیجئے۔ وہ اس وقت تو دفتر سے چلے گئے لیکن شام کو انھوں نے عجیب حرکت کی۔ اس زمانے میں' میں G.O.R III کے Govt: officers Hostel میں رہتا تھا۔ وہ شام کو وہاں آگئے اور جب کہ میں سیڑھیوں سے اوپر چڑھ رہا تھا' وہ مجھے سیڑھیوں میں کھڑے ملے اور یہ کہہ کر کہ جناب میں نے آپ کی کوئی خدمت تو کی ہی نہیں ہے مجھے کئی ہزار روپے بطور رشوت دینے کی کوشش کی' اس بات پر مجھے غصہ آیا کہ ' میں نے انھیں برا بھلا کہہ کر وہاں سے نکال دیا اور اگلے روز Chief Secretry کو اس کے بارے میں لکھ کر رپورٹ کر دی۔ بس یوں سمجھئے کہ یہ میری زندگی کا آخری پرسکون دن تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ مارشل لاء کے زمانے میں اس قسم کے لوگوں کو فوری اور عبرت ناک سزا ملے گی' لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ناصرام خان صاحب ایک بریگیڈیر Aziz uddin کے سگے بھائی ہیں اور ان کے پاس ادھر ادھر لٹانے کے لئے کروڑوں روپے ہیں۔

چنانچہ ناصرام خان نے اپنے اثر رسوخ اور پیسے کو اس طرح استعمال کیا کہ مارشل لاء والے الٹی میری جواب دہی پر اتر آئے۔ جب میں نے پہلی شکایتوں کا تحریری جواب بھیجا تو یہ جواب اس وقت کے Governer ,MLA جناب عتیق الرحمن کے سامنے پیش ہوا اور انھوں نے یہاں تک شرافت دکھائی کہ Chief Secretry کو معافی نامہ لکھ کر بھیجا اور ناصرام خان کی ان بے ہودہ شکایتوں کو واپس لے لیا گیا۔

اس کے بعد چیف سیکریٹری نے مجھ سے کہا کہ اب میں اس معاملے میں خاموشی ہی اختیار کر لوں تو اچھا ہے' کیونکہ ناصرام خان مغربی پاکستان کا انتہائی بارسوخ آدمی ہے' اور چونکہ میں تاریک الدنیا لوگوں میں سے ایک ہوں اس لئے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا اور مجھ پر ہی گندگی اچھلے گی۔

چیف سیکریٹری کی اس نصیحت پر میں تو کاربند ہو گیا لیکن نامراد خان نے سارے صوبے میں اپنے ٹھیکیدار اور بدمعاش پھیلا دیئے کہ جہاں جہاں میں ملازمت پر رہا ہوں' وہاں سے میرے خلاف کچھ کہانیاں اور کچھ شکایتیں بھجوائی جائیں۔ چنانچہ مئی۔جون سے اس طرح کی شکایتوں اور حرامزدگیوں کا اتنا بڑا طوفان بن گیا جس کی حد نہیں۔ میں نے ایک بار چیف سیکریٹری کو تحریراً اس کی اطلاع بھی دی لیکن وہ خود اس زمانے میں ٹرانسفر ہونے والے تھے اور میری کسی شکایت پر آج تک کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔

کئی مہینوں کے ہر دن اور ہر رات مجھ پر اتنا ہراس اور خوف مسلط کیا جاتا رہا کہ یہ ہر آدمی کی برداشت سے باہر ہے۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں نے حرام کے پیسے ٹھکرا دیے تھے۔ (۱۸)

لیکن اس عتاب کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ مصطفےٰ زیدی نے سابق صدر یحییٰ خان کے خلاف ایک نظم لکھی اور دوستوں کو ٹیلی فون پر سناتا رہا۔ اس نظم میں پاکستان کو "جیل خانہ" اور یحییٰ خان کو "داروغۂ جیل" کے نام دیئے گئے تھے۔

مئی ۱۹۷۰ء میں ملازمت سے برطرفی کا فیصلہ پڑھ کر مصطفےٰ زیدی نے اپنی ڈائری میں لکھا:

"۱۴ سال کی سرکاری ملازمت کے بعد برطرف کر دیا گیا۔ آزادیٔ عمر نو مبارک "مئی ۱۹۷۰ء

کچھ مدت بعد مصطفےٰ زیدی نے لاہور سے کراچی کا سفر کیا اور بیوی بچوں کو جرمنی بھیج دیا۔ کراچی سے لکھے ہوئے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کے ایک خط میں عصمت بیٹی کو لکھا:

"میری پیاری عمی'

تمہارے خط مورخہ ۲۰ ستمبر کا شکریہ' جس سے مجھے تمہارے اسکول' تمہارے دوستوں اور ہاسٹل کا سارا حال معلوم ہو گیا ہے۔ مجھے تم سب کی یاد بہت ستا رہی ہے اور میں تمہارے پاس پہنچنے کی بہت سخت کوشش کر رہا ہوں۔ وہ ایک شاندار دن ہو گا۔ تمہاری امی نے مجھے بتایا ہے کہ تم

ایک مرتبہ محض اس لئے روئیں کہ تمہارے جرمن مضمون میں پچیس غلطیاں تھیں۔ کیا یہ کوئی اتنی اہم بات تھی کہ اس کے لئے رویا جائے' جب کہ تم یہ جانتی تھیں کہ تم نے ابھی ایک نئی زبان سیکھنی شروع کی ہے؟

ایک پرندے کی طرح گاؤ۔ ایک منور دن کی طرح خوش رہو اور تازہ ہوا کی طرح چلو پھرو۔ غلطیوں پر روؤ مت۔ انہیں صبر و تحمل کے ساتھ زیر کرنا سیکھو" (۱۹)

۸ اکتوبر ۱۹۷۰ء ------- ایک خط ویرا کے نام:

"میری پیاری ویرا'

مجھے اس لمحے سوائے تمہارے اور کسی کا خیال نہیں آرہا اور میں اس کھیل کے متعلق سوچ رہا ہوں جو قسمت ہماری زندگیوں کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ میں نے مصیبت' رسوائی اور پریشانی کی زندگی بسر کی ہے۔

از راہ کرم' اسے صبر کے ساتھ برداشت کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تم اس کے متعلق کچھ کر سکو تو بہت اچھا ہے۔ اگر نہ کر سکو تو مہربانی کر کے اس ابتلاء کو بھی سہہ لو۔ ہمیں اپنے آپ کو تباہ نہیں ہونے دینا چاہیے۔ (۲۰)

لیکن معاشرے کے جبر کے خلاف جہاد کرنے والے اور دوسروں کو دلاسا دینے والے مصطفےٰ زیدی کی لاش ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو کے۔ڈی۔اے سکیم نمبر ۱۔B-۲ کے فلیٹ سے ملی۔ ناک تکیے اور بستر پر خون کے دھبے تھے۔ ٹیلی فون الٹا پڑا تھا اور ٹیلی فون کا تار اس کے سینے پر تھا۔ ساتھ کے کمرے میں بستر اور فرش پر چار درجن سے زائد نائکل کی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ شہناز گل بے ہوش پڑی تھی۔ مصطفےٰ زیدی کے کمرے میں بستر کے پاس زہریلی کافی کا پیالہ رکھا تھا۔

روزنامہ "جنگ" کراچی مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے مطابق پولیس کو شہناز گل کے بالوں سے مشابہ ایک بال مصطفےٰ زیدی کے بستر پر سے ملا اور بستر پر جو دھبے تھے وہی شہناز گل کے کپڑوں پر بھی پائے گئے۔

جب یہ حادثہ پیش آیا ہے' اس وقت مصطفےٰ زیدی کی والدہ اپنے ازل سے پریشان

حال بیٹے کے لئے رسول کے نواسوں کے روضوں پر اس کی صحت' عزت اور سلامتی کی دعائیں مانگتی پھر رہی تھیں۔

پولیس نے خودکشی کا مقدمہ درج کر کے' مصطفےٰ زیدی کی لاش اپنی نگرانی میں سول اسپتال کراچی بھیج دی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد شام سات بجے رضویہ امام باڑے میں سینکڑوں افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی' بعدازاں مرحوم کو خراساں باغ کراچی کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ طبی رپورٹ کے مطابق مصطفےٰ زیدی کی موت زہر کے اثرات کے تحت دم گھٹنے سے واقع ہوئی۔ سو قتل کیے جانے کا امکان موجود تھا۔

روزنامہ جنگ کراچی مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے مطابق: کراچی کے فیشن ایبل ہوٹلوں' بڑے بڑے پرائیوٹ کلبوں اور ائرپورٹ کی فضائی کمپنیوں کے زیر انتظام چلنے والے ہوٹلوں سے حسیناؤں کا جھرمٹ اچانک غائب ہو گیا۔ ان جگہوں پر بے شمار سوسائٹی گرلز رنگین قمقموں میں جھلملاتی نظر آتی تھیں۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق بڑے بڑے نائٹ کلبوں میں جہاں اکثر بڑے بڑے افسر اور سرمایہ دار تاریکی میں حسیناؤں کی زلفوں میں کنگھی کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں اب کوئی افسر نظر نہیں آتا۔ زیدی مرحوم کے واقعہ سے بڑے بڑے کلبوں پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ اس اداسی کی وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔"

مصطفےٰ زیدی کی ناوقت موت پر پاکستان بھر کے ادبی حلقوں میں تعزیتی جلسے کئے گئے اور مرحوم کا سوگ منایا گیا۔

پولیس نے ابتدائی پوسٹ مارٹم کی طبی رپورٹ میں ظاہر کئے گئے شک اور مصطفےٰ زیدی کے چھوٹے بھائی سید ارتضیٰ حسنین زیدی (سیکنڈ سیکرٹری سنٹرل بورڈ آف ریونیو' اسلام آباد) کے بیان حلفی کی روشنی میں ۵ نومبر ۱۹۷۰ء کو شہناز گل کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا۔

سید ارتضیٰ حسنین زیدی نے اپنے تحریری بیان نومبر ۱۹۷۰ء میں بتایا تھا کہ:
"جب سے مصطفےٰ بھائی کراچی منتقل ہوئے تھے وہ مجھے تقریباً" روزانہ ایک مرتبہ ضرور ٹیلی فون کر لیتے تھے اس طرح ایک دوسرے کی خیریت بھی معلوم ہو جاتی تھی اور حالات کا بھی علم رہتا تھا۔ جب میں کراچی سے اسلام آباد پہنچا اس

کے بعد بھی وہ مجھے اسی طرح برابر ٹیلی فون کرتے رہتے۔ ٹیلی فون پر میری اور انکی آخری بات ۸ اکتوبر بروز جمعرات ہوئی ہے۔ اس دن انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت تک ان کو جرمنی جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ انکو اجازت انشاء اللہ مل ہی جائے گی۔ چونکہ اسی دن میں اپنے خسر کے چہلم کے سلسلے میں لاہور جانے والا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ ان کا پاسپورٹ فاروق (جو کہ ہم دونوں کا مشترکہ دوست ہے) کے پاس ہے' اور میں فاروق سے یہ کہہ دوں گا۔ اگر نیا پاسپورٹ بنوانے کی ضرورت پڑے تو وہ مصطفےٰ بھائی کی تصویریں اور کاغذات وغیرہ تیار رکھیں۔ تاکہ جیسے ہی مصطفےٰ بھائی کو جرمنی جانے کی اجازت ملے وہ فوراً" ہی پاسپورٹ وغیرہ بنوا سکیں اور اسکی وجہ سے دیر نہ ہو۔

اس دن وہ بہت ہی خوش اور مطمئن معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے اسی دن لاہور کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اپنی والدہ کو جو زیارت کے واسطے گئی ہوئی ہیں بغداد کے پتہ پر خط لکھے تھا جس میں ان کو یہ بھی لکھا تھا کہ مصطفےٰ بھائی سے میری بات ہوئی ہے اور وہ بالکل تندرست' ٹھیک' خوش اور مطمئن ہیں لہٰذا ماں ہم لوگوں کی طرف سے بے فکر ہو کر زیارت وغیرہ کریں۔ مصطفےٰ بھائی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں لاہور سے کب واپس آونگا۔ میں نے ان کو بتایا تھا کہ میں ۱۲ اکتوبر کو لاہور سے اسلام آباد آؤنگا۔ اس پر انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے منگل ۱۳ اکتوبر کو ٹیلی فون کریں گے اور اس کے بعد دو چار دن کے لئے اسلام آباد بھی آئیں گے۔ باتوں کے دوران میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ جب وہ جرمنی جائیں گے تو میں ان سے ملنے اور ان کو رخصت کرنے کراچی آؤں گا۔ اس پر انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ خود میرے پاس اسلام آباد آئیں گے۔ اور میرے ساتھ ایک دو دن رہ کر جرمنی جائیں گے۔ منگل ۱۳ اکتوبر کو انکا ۸ اکتوبر کا لکھا ہوا خط بھی ملا جس کے ساتھ انہوں نے وہ درخواست بھی لکھی تھی جس میں انہوں نے مارشل لاء کے حکام کو لکھا تھا کہ مصطفےٰ بھائی نے مارشل لاء حکام کے اس خط کی نقل جس میں ویرا بھابی کی بیماری کی تشخیص جرمنی میں پاکستان ایمبسی سے کرانے کے لیے ہدایت کی تھی۔ ویرا بھابی کو ۔ بھیجدی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ

مصطفٰے بھائی نے اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ ا-ممبسی Bonn میں ہے جبکہ ویرا بھابی میونخ (Munich) میں ہیں اور بیمار ہیں اور دن میں بطور سیلز مین اور رات میں بطور ٹیلی فون آپریٹر کام کرتی ہیں- اس لئے ویرا بھابی کو ا-ممبسی کا سرٹیفکیٹ لینے میں بہت دشواری ہو گی- لہٰذا مصطفٰے بھائی نے مارشل لاء حکام سے درخواست کی کہ وہ مصطفٰے بھائی کو(Humanitarian Grounds) پر جرمنی جانے کی اجازت دے دیں تاکہ وہ اپنے بیوی بچوں سے جا کر مل سکیں- یہ درخواست میں بھیج ہی نہ سکا اس لئے کہ اسی دن مجھے ان کے انتقال کی خبر مل گئی- یہاں پر میں دو باتیں واضح کردوں- ایک یہ کہ مصطفٰے بھائی مجھ کو اس طرح کی درخواستیں لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے اور پھر میں ان کے کہنے کے مطابق عموماً بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجدیا کرتا تھا- دوسری بات کہ ویرا بھابی نے مجھے اب کراچی میں بتایا ہے کہ انہوں نے مطلوبہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا اور ۳ اکتوبر کو جرمنی سے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ مصطفٰے بھائی کے پتہ پر بھیج دیا تھا-

منگل ۱۳ اکتوبر کو میں مصطفٰے بھائی کے ٹیلی فون کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ تقریباً ساڑھے بارہ بجے کسی صاحب نے کراچی سے مجھے ٹیلی فون کیا کہ شاہد عابدی صاحب نے کہلوایا ہے کہ مصطفٰے بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے اور میں فوراً بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچ جاؤں- میں نے جب پوچھا کہ وہ کیا بیمار ہیں تو مجھے بتایا کہ ٹیلی فون کرنے والے کو کچھ پتہ نہیں- ابھی یہ ٹیلی فون بند ہی ہوا تھا کہ نذیر حیدر صاحب نے کراچی سے ٹیلی فون کر کے بتایا کہ مصطفٰے بھائی کا صبح انتقال ہو چکا ہے- انہوں نے بھی وجہ انتقال نہ بتائی- جب میں شام کو اپنی اہلیہ کے ساتھ کراچی پہنچا تو اس وقت جنازہ بالکل تیار تھا اور صرف میرا انتظار کیا جا رہا تھا- اس رات' میں بھی اور میرے بھائی بھتیجے سب بہت ہی پریشان تھے انہوں نے اس رات بھی اور اگلی صبح بھی یہ بتایا کہ ایک کمرہ میں مصطفٰے بھائی مردہ پائے گئے اور اسی مکان کے دوسرے کمرے کے دروازہ کے پاس ایک عورت بنام شہناز دروازے کے پاس لیٹی ہوئی ملی- جس کو اسپتال لے جایا گیا ان لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ ایک شخص سلیم خان جو کہ شہناز کا شوہر ہے ۲ اور ۳ اکتوبر کی رات کو

تقریباً" ڈھائی تین بجے شاہد عابدی صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ اس کی (سلیم خان) بیوی تقریباً" بارہ بجے دن سے گئی ہوئی ہے اور اس وقت تک واپس نہیں آئی' جس کی وجہ سے بچے پریشان ہیں۔ وہ (شہناز) مصطفےٰ کے یہاں ہو گی' لہٰذا چل کر دیکھا جائے۔ انہی لوگوں کے کہنے کے مطابق شاہد عابدی' انکی بیگم اور سلیم خان اسی وقت مصطفےٰ بھائی کے مکان پر آئے اور چوکیدار سے پوچھا کہ صاحب کہاں ہیں۔ چوکیدار نے ان تینوں کو بتایا کہ مصطفےٰ بھائی نے پیر کے دن صبح اس کو چھٹی دیدی تھی اور جب وہ شام تقریباً" ساڑھے پانچ چھ بجے واپس آیا تو مصطفےٰ بھائی اندر ہی تھے۔ اس لئے کہ موٹر گیراج میں کھڑی تھی اور اس کے بعد سے صاحب باہر نہیں آئے۔ شاہد عابدی صاحب وغیرہ نے گھر کے دروازے کو کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس پر ان تینوں نے یہ طے کیا کہ صبح تقریباً" آٹھ بجے آکر پھر دیکھا جائیگا۔ بقول ان لوگوں کے سلیم خان نے شاہد عابدی صاحب سے یہ بھی کہا کہ شاہد عابدی صاحب' سلیم خان کے گھر سے صبح ساتھ لے لیں۔ یہ طے کر کے یہ تینوں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اس کے بعد شاہد عابدی صاحب نے تقریباً" چھ بجے صبح ماموں حسن مصطفےٰ کو ٹیلی فون کر کے یہ سب کچھ بتایا اور یہ کہا کہ وہ جعفر رضوی کے یہاں جا رہے ہیں' جہاں ماموں جعفر رضوی کے یہاں پہنچ گئے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے یہ خیال کیا کہ جب سلیم خان رات یہ کہہ رہا تھا کہ اس کی بیوی بھی مصطفےٰ کے یہاں ہے' ہو سکتا ہے کہ کچھ گڑبڑ ہو۔ لہٰذا بہتر ہے کہ کسی مجسٹریٹ کو مطلع کر کے ساتھ لے لیا جائے لہٰذا وہ لوگ مجسٹریٹ کے گھر گئے اور وہاں اس کو رات کا واقعہ بتایا۔ اتنے میں کہ مجسٹریٹ چلنے کے لئے تیار ہوں ماموں اور شاہد عابدی صاحب نے مناسب سمجھا کہ مصطفےٰ زیدی کے مکان پر ایک مرتبہ پھر معلوم کر لیا جائے شاید دروازہ کھل چکا ہو لیکن جب انہوں نے وہاں جا کر پھر دروازہ بند پایا تو وہ مجسٹریٹ کے گھر واپس آ گئے۔ مجسٹریٹ نے پولیس کو فون کر کے مصطفےٰ بھائی کے مکان پر پہنچنے کی ہدایت کی اور خود شاہد عابدی' جعفر رضوی اور ماموں کے ساتھ مصطفےٰ بھائی کے مکان پر آ گئے۔ یہاں پہلے دروازہ کھٹکھٹایا اور جب کوئی آواز نہ آئی تو سوچا کہ پہلے

کھڑکی کے پاس سیڑھی لگا کر دیکھ لیا جائے۔ سیڑھی لگا کر شاہد عابدی صاحب نے دیکھا تو صرف مصطفیٰ بھائی کے پیر نظر آئے ان کے پکارنے پر کوئی جواب نہ ملا اتنے میں پولیس بھی آگئی تھی۔ پھر ان لوگوں نے دروازہ توڑنے کے متعلق طے کیا۔ اس وقت شاہد عابدی صاحب کو خیال آیا کہ انہوں نے سلیم خان سے اس کے مکان پر آٹھ ساڑھے آٹھ بجے جانے کا وعدہ کیا تھا اور فوراً سلیم خان کے مکان پر گئے۔ جہاں سے سلیم خان اور ان کا ایک دوست جس کا نام قریشی بتایا جاتا ہے اسی کار میں اور شاہد عابدی صاحب اسی کار میں مصطفیٰ بھائی کے مکان پر آئے۔ جس وقت یہ لوگ وہاں پہنچے پولیس مکان کا دروازہ توڑ رہی تھی۔ دروازے توڑنے کے بعد شاہد عابدی صاحب' جعفر رضوی صاحب' سلیم خان اور ان کا دوست' پولیس اور مجسٹریٹ کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئے جہاں انہوں نے مصطفیٰ بھائی اور شہناز کو مذکورہ بالا حالت میں پایا۔ پولیس کا ایک آدمی فوراً پی آئی اے کے ہسپتال) جو کہ مصطفیٰ بھائی کے مکان کے تقریباً سامنے ہے) نے مصطفیٰ بھائی کو دیکھنے کے بعد مردہ بتایا اور شہناز کو اسپتال لے جانے کی رائے دی۔ اس لئے مجھے یہ بھی بتایا گیا جیسے ہی سلیم خان اوپر پہنچا تھا اس نے شہناز کو دیکھتے ہی کہا کہ شہناز تم کو مصطفیٰ نے کیا پلا دیا ہے۔ اس پر شہناز نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور چیخ پڑی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ واقعہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے کا بتایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کے دیکھنے کے بعد پولیس اور سلیم خان کا دوست شہناز کو نیچے لانے لگے۔ سلیم خان اس سے پہلے ہی شہناز کا پرس اٹھا کر نیچے آچکا تھا۔ جس کے بعد وہ پھر اوپر چلا گیا تھا۔ اس وقت تک ماموں حسن مصطفیٰ' نیچے ہی اپنی کار میں سر پکڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر ماموں حسن مصطفیٰ' شاہد عابدی وغیرہ نے میرے بھتیجے شاہد رضا کو ٹیلی فون پر اطلاع دی۔

شاہد رضا جب مصطفیٰ بھائی کے مکان پر پہنچے تو وہاں سوائے ایک دو سپاہیوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ شاہد رضا فوراً ہی اپنے چھوٹے بھائی قیصر رضا کو بلانے چلے گئے اور پھر وہاں سے آکر مصطفیٰ بھائی کے مکان میں اوپر گئے جہاں مصطفیٰ بھائی مردہ پڑے تھے اور پولیس والے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے

کہ مصطفےٰ بھائی بالکل سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ صرف ان کا چہرہ تھوڑا سا داہنی طرف مڑا ہوا تھا۔ داہنا ہاتھ کندھے کی طرف تھا۔ اور اسکی انگلیاں بھی مڑی ہوئی تھیں۔ بایاں ہاتھ پیٹ پر ناف کے پاس رکھا ہوا تھا۔ قمیض کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور وہ پتلون پہنے ہوئے تھے پیر میں کچھ مٹی لگی ہوئی تھی۔ گردن پر بائیں طرف ہتھیلی سے ذرا اوپر کچھ نشان تھے۔ ناک سے خون کان کی طرف گیا ہوا تھا۔ لیکن نہ ہی وہ بہت تر تھا اور نہ ہی بالکل خشک۔ ٹیلی فون پلنگ کے پاس نیچے ٹیڑھا پڑا ہوا تھا۔ اور اس کا رسیور پلنگ پر مصطفےٰ بھائی کے بائیں طرف پڑا تھا۔ ٹیلی فون رسیور کا تار مصطفےٰ بھائی کے بدن کے اوپر پیٹ سے ذرا نیچے پڑا ہوا تھا۔ تکیے اور میٹرس پر خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ ایک چھوٹا گلاس پلنگ کے پاس رکھی ہوئی الماری اور ریڈیو گرام کے درمیان فرش پر بالکل خشک پڑا تھا۔ ریڈیو گرام کے پاس کی سیڑھی ٹیڑھی پڑی تھی۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دو بندے پلنگ کے پائنتی کی طرف سامنے کی الماری اور پلنگ کے درمیان کھڑکی کی جانب فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے کا پنکھا اور ایئر کنڈیشنر چل رہے تھے۔ دوسرے کمرے کا پنکھا بھی چلتا ہوا بتایا گیا ہے۔ دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے لیکن لائٹ اون نہیں تھی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب مصطفےٰ بھائی کی لاش کو اٹھایا تو ان کے بدن کے نیچے جہاں ریڑھ کی ہڈی ختم ہوتی ہے بہت سی پنتھلین کی گولیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک ولائی تقریباً اسی جگہ جہاں بندے پڑے ہوئے تھے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک چادر فرش پر پلنگ اور کھڑکی کے درمیان پڑی ہوئی تھی اور ایک چادر فرش ہی پر دائیں طرف پڑی ہوئی تھی۔ یہ ساری باتیں جو میں نے بتائی ہیں یہ مجھے شاہد رضا' قیصر رضا' ماموں حسن مصطفےٰ' شاہد عابدی اور ان کی بیگم صاحب سے باتیں کرنے سے معلوم ہوئیں۔

۲۳ اکتوبر کو میں' شاہد رضا' شاہد عابدی' ان کی بیگم' ماموں حسن مصطفےٰ اور ان کی بیگم کے ساتھ اس مکان پر گیا اور اقبال چوکیدار سے میں نے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ پیر کے دن مصطفےٰ بھائی تقریباً آٹھ بجے صبح کار میں کہیں گئے تھے اور تقریباً پندرہ ہی منٹ بعد واپس آگئے تھے۔ اس کے بعد بقول چوکیدار' اس

نے اور مصطفیٰ بھائی نے کار دھوئی تھی۔ کار دھونے کے بعد مصطفیٰ بھائی کار پونچھنے لگے اور اقبال سے کہا کہ وہ اندر جا کر کمرے وغیرہ صاف کر دے۔ کار پونچھنے کے بعد مصطفیٰ بھائی نے کار گیراج میں کھڑی کر دی اور خود گھر میں چلے گئے۔ کمرے وغیرہ صاف کر کے اقبال باہر آگیا۔ تھوڑی دیر میں مصطفیٰ بھائی نے (بقول اقبال) اسے کہا کہ وہ چھٹی کر لے۔ اقبال نے کہا کہ وہ کہاں جائے تو انہوں نے کہا کہ کہیں بھی چلے جاؤ اور شام کو کسی وقت بھی واپس آجاؤ اس سے پہلے بقول اقبال کے انہوں نے اس کو کبھی چھٹی نہیں دی تھی۔ بقول اقبال وہ تقریباً ساڑھے دس بجے وہاں سے چلا گیا تھا اور اس وقت تک سوائے شاہد رضا اور ڈاکیے کے کوئی بھی آیا گیا نہ تھا۔ چونکہ مجھے یہ بتایا جا چکا تھا کہ مصطفیٰ بھائی کے پیر میں مٹی لگی ہوئی تھی۔ اور چونکہ مجھے یہ یقین تھا کہ مصطفیٰ بھائی کے کمروں میں صفائی رہتی ہے' میں نے اقبال سے خاص طور سے پوچھا تھا کہ اس نے صرف کمرے کی چیزیں ہی صاف کیں تھیں یا کہ فرش وغیرہ سیڑھیاں اور باورچی خانہ وغیرہ بھی صاف کیا تھا' اس پر اقبال نے مجھے بتایا کہ فرش سیڑھیاں اور باورچی خانہ کی زمیں بھی صاف کی تھی بلکہ باورچی خانہ کی زمین پر تاکی بھی لگائی تھی۔ مجھے اب بھی حیرت ہے کہ ان حالات کے باوجود مصطفیٰ بھائی کے پیر میں مٹی کس طرح لگی؟ چونکہ اس سے پہلے شاہد عابدی کی بیگم صاحبہ نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے پیر کی صبح تقریباً ساڑھے سات آٹھ بجے جب مصطفیٰ بھائی سے ٹیلی فون پر بات کی تھی تو مصطفیٰ بھائی نے ان کو بتایا تھا کہ وہ صبح کے تین بجے کے گئے ہوئے اسی وقت واپس آئے تھے۔ اس لئے میں نے اقبال سے خاص طور سے دریافت کیا کہ وہ کس جگہ پلنگ بچھا کر سوتا ہے۔ اس پر اس نے مجھے بتایا کہ وہ گھر کے پھاٹک کے اندر پھاٹک سے بالکل ملا کر پلنگ بچھاتا ہے۔ تاکہ اگر باہر سے کوئی آئے تو اسے فوراً معلوم ہو جائے۔ اس نے مجھے وہ جگہ دکھائی جہاں بقول اس کے وہ پلنگ بچھاتا ہے۔ اس سے میں نے یہ بھی خاص طور سے دریافت کیا کہ رات میں یا صبح ہوتے یعنی اتوار اور پیر کی درمیانی شب میں کوئی یا مصطفیٰ بھائی باہر گئے تھے یا نہیں۔ اس پر اقبال نے مجھے بتایا کہ جس وقت سے اس نے اپنے لیٹنے کے لئے

پھاٹک کے پاس پلنگ بچھایا تھا اس وقت سے پیر کی صبح تقریباً" آٹھ بجے تک نہ ہی مصطفےٰ بھائی اور نہ کوئی اور باہر گیا۔ میں نے اس سے جب دریافت کیا کہ اس نے کس وقت وہاں پلنگ بچھایا تھا تو اس نے مجھے تقریباً" دس بجے رات کا وقت بتایا۔ مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ جب بقول شاہد عابدی صاحب کی بیگم صاحبہ مصطفےٰ بھائی نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اتوار اور پیر کی درمیانی رات تقریباً" تین بجے گئے ہوئے تھے اور بقول اقبال اس رات تقریباً" دس بجے کے بعد کوئی بھی باہر نہیں گیا اور نہ ہی گھر کا پھاٹک کھلا تو یہ سب کیسے ہوا؟ لہٰذا میں نے وہیں پھر شاہد عابدی صاحب کی بیگم سے یہ دریافت کیا جس پر انہوں نے اپنی پہلی بات پھر دہرائی۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ اقبال کے کہنے کے مطابق تقریباً" دس بجے رات سے مصطفےٰ بھائی کہیں نہیں گئے کیونکہ وہ پھاٹک کے ساتھ ہی لیٹا ہوا تھا اور پھاٹک نہیں کھلا۔ اس وقت شاہد عابدی صاحب کی بیگم صاحبہ نے کہا کہ ہو سکتا ہے مصطفےٰ بھائی نے ٹیلیفون پر پھر یہ کہا ہو کہ وہ رات کے تین بجے سے جاگ رہے ہیں۔ اس دن جب میں پولیس کے ساتھ اس مکان میں اندر گیا اور کمرے کا جائزہ لینے کے بعد نیچے باورچی خانہ میں آیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سنک کے پاس ایک اسٹول پر ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی جس میں ایک ٹی پاٹ تھا جو پانی سے آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ اس پر ٹی کوزی ڈھکی ہوئی تھی۔ اسی ٹرے میں ایک پلیٹ اور ایک گول کیک رکھا ہوا تھا جو تھوڑا سا کٹا ہوا تھا۔ ایک پیالی تھی جس سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس میں کافی بنائی گئی ہے۔ ایک اور پیالی تھی جس سے پتہ چل رہا تھا کہ جیسے اس میں کوفی پی گئی تھی۔ دو پلیٹیں' دو چمچیاں' ایک بڑا گول چمچہ ایک کیک کاٹنے کو چھری اور تھوڑی سی روئی رکھی ہوئی تھی۔ سنک میں ایک وہ مگ رکھا تھا جسمیں مصطفےٰ بھائی خود چائے کوفی وغیرہ پیا کرتے تھے۔ اسی سنک میں ایک اور مگ رکھا ہوا تھا۔ یہ دونوں مگ بظاہر صاف تھے اور ان دونوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ سنک کے پاس والی جگہ میں اور چیزوں کے علاوہ ایک گلاس رکھا تھا۔ جس میں کچھ قطرے شربت نما جیسی چیز کے تھے۔ اس گلاس میں ایک چمچی بھی پڑی ہوئی تھی۔ اسی کے پاس ایک شربت کا ڈبہ بھی رکھا ہوا

تھا۔ چولہے پر دو خالی پتیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سنک کے پاس والی جگہ کے نیچے ایک ٹین کا ڈبہ رکھا ہوا تھا جس میں جلے ہوئے کاغذات اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے اسی ڈبے میں جلائے گئے ہوں۔ اسٹول کے قریب ایک میز پر دیگر چیزوں کے علاوہ دو فائل کور اور ٹیپ ریکارڈر کی ایک خالی ریل رکھی ہوئی تھی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی اور بہت سے خیالات میرے ذہن میں آئے۔
سب سے پہلے تو یہ کہ پولیس والوں نے ان چیزوں کا پہلے ہی دن جائزہ کیوں نہیں لیا' یا اگر انہیں اس وقت اس کی فرصت نہیں تھی تو انہوں نے باورچی خانہ سیل (Seal) کیوں نہیں کیا؟ ان چیزوں کو اس وقت کیمیکل ایگزامنیشن کے لئے کیوں نہیں بھیجا؟ ان چیزوں پر سے فنگر پرنٹس کیوں نہیں لئے گئے تاکہ پتہ چلتا کہ ان برتنوں کو کس کس نے چھوا ہے؟

دوسرے یہ کہ ان برتنوں کو اوپر سے نیچے کیوں لایا گیا اور کون لایا۔ اگر مصطفےٰ بھائی خودکشی ہی کر رہے تھے تو اول تو ان کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ برتن نیچے لا کر رکھتے دوم کیا کچھ کھانے کے بعد کسی میں اتنی طاقت ہو سکتی ہے اور کیا وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ اوپر سے برتن سنبھال کر نیچے لا کر قاعدے سے رکھ سکے اور پھر اس کے بعد وہ خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا سکے؟ پھر یہ کہ اگر یہ کہا جائے کہ کمرے میں برتن سجائے اور پھر وہیں باورچی خانہ میں کھڑے ہو کر کوئی پیئے۔ دوم یہ کہ اگر کوئی نیچے بھی پی لے تو کیا اس کی ایسی حالت رہ سکتی ہے کہ وہ سلیقے سے برتن وغیرہ رکھ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا سکے؟ اس کے علاوہ اس کمرے میں روئی ہونے کی کیا وجہ تھی؟ اسی طرح اس گلاس کو اسی وقت لے کر اس کا ٹھیک سے معائنہ کیوں نہیں کیا گیا۔ جس میں کہ شربت نما چیز کے قطرات تھے؟ جس میں وہ خود کوفی پیا کرتے تھے وہ صاف کیوں رکھا تھا اور اس میں پانی کیوں بھرا ہوا تھا؟ اس مگ کا معائنہ کیوں نہیں کیا گیا؟ جلے ہوئے کاغذات اور اس ٹین کا معائنہ کیوں نہیں کیا گیا؟ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ تمام معائنے ٹھیک سے کیے جاتے اور ان تمام چیزوں کو ٹھیک سے شامل تفتیش کیا جاتا اور یہ معلوم کیا جاتا کہ برتن کیسے نیچے آئے' کون لایا' کب آئے تو مجھے یقین ہے کہ یہ ثابت

ہو جاتا کہ مصطفیٰ بھائی نے ہرگز ہرگز خودکشی نہیں کی ہے بلکہ ان کو کسی نے ضرب پہنچا کر اور زہر دے کر قتل کیا ہے۔ میں ان تمام باتوں کا جائزہ لینے کے بعد اور اسی طرح کی بہت سی باتوں سے حتمی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مصطفیٰ بھائی نے خودکشی ہرگز ہرگز نہیں کی ہے بلکہ ان کو کسی سازش کا شکار بنایا گیا ہے۔ خودکشی کرنے کی قطعاً" کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس عرصہ میں مجھ سے بھی جو ان کی باتیں ہوئی ہیں اور میرے علاوہ جن جن لوگوں سے بھی ان کی باتیں ہوئی ہیں وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس زمانے میں مصطفیٰ بھائی Depressed تو کیا بلکہ بہت ہی خوش، مطمئن اور نارمل تھے۔ شاہد رضا جو کہ پیر ۱۲ اکتوبر کو دن کے تقریباً" دس سوا دس بجے مصطفیٰ بھائی سے ان کے مکان پر ملے تھے۔ بتاتے ہیں کہ مصطفیٰ بھائی کسی حال میں بھی اس وقت پریشان نظر نہیں آرہے تھے بلکہ وہ اسی طرح نارمل ہشاش بشاش تھے جیسے کہ وہ رہا کرتے تھے۔ ایک عظیم شاعر جو کہ حساس بھی ہوتا ہے کبھی اپنی پریشانی اور الجھن کو چھپا نہیں سکتا۔ اس لئے اگر وہ اس وقت کسی وجہ سے پریشان ہوتے یا اتنا اہم قدم اٹھانے جاتے تو یہ ناممکن ہے کہ ان کے چہرے سے پریشانی ظاہر نہ ہوتی۔ میں نے اور بھی لوگوں سے دریافت کیا ہے۔ ان میں خاص طور سے ثقلین زیدی اور علاء الدین صاحب سی ایس پی جو کہ میرے نزدیک بہت ہی مدبر اور سنجیدہ، قابل اعتماد اور ذمہ دار شخص ہیں قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ مرحوم کے آخری ایام میں ان سے ملے تھے۔ یہ بہت ہی پرزور الفاظ میں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مصطفیٰ بھائی کے ذہن کے آس پاس بھی خودکشی کا خیال تک نہیں تھا اور وہ جرمنی جانے اور اپنے بیوی بچوں سے جلد از جلد ملنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالانکہ ان کو اس وقت تک جرمنی جانیکی اجازت نہیں ملی تھی اور اس میں کچھ دیر ہو رہی تھی لیکن پھر بھی وہ دل برداشتہ نہیں ہوئے تھے اور پرامید تھے کہ اجازت مل جائیگی انہوں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر انہیں مستقبل قریب میں اجازت نہ بھی ملی تو وہ ویرا بھابی اور بچوں کو اسکول کی چھٹیوں میں پاکستان بلا لیں گے۔ یہ بات ان کے اس خط سے بھی صاف ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے ۸ اکتوبر کو ویرا بھابی کو جرمنی بھیجا تھا۔ اگر

کسی شخص کے ذہن میں خودکشی کا ذرا سا بھی خیال ہو تو وہ اس طرح کی نہ تو پلاننگ کر سکتا ہے اور نہ ہی اتنا خوش اور نارمل نظر آسکتا ہے۔ میں مصطفےٰ بھائی کے ساتھ پلا بڑھا ہوں۔ بچپنے سے ان کے ساتھ رہا ہوں میں ان کی فطرت اور عادت سے بخوبی واقف ہوں۔ ہم دونوں نہ صرف ایک دوسرے کے بھائی تھے بلکہ ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ وہ شروع ہی سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کو میرا بہت خیال تھا۔ مجتبیٰ بھائی مرحوم کے انتقال کے بعد تو ہم اور بھی زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہو گئے تھے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر میں پورے یقین اور پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ اگر مصطفےٰ بھائی نے خودکشی کرنے کا ذرا سا بھی ارادہ کیا ہوتا یا اگر انہوں نے خودکشی کی ہوتی تو یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ مجھے ہمت دلانے اور حوصلہ سے کام لینے کے لیے کوئی خط نہ لکھتے یا تحریر نہ چھوڑتے۔ اسی طرح ان کو اماں کا بھی بے انتہا خیال تھا۔ وہ ہمیشہ اسی کوشش میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اماں مجتبیٰ بھائی مرحوم کے غم کو بھول جائیں۔ وہ اماں کی ذرا سی تکلیف' بیماری یا پریشانی سے خود اسقدر پریشان ہو جاتے تھے اور اتنے متاثر ہوتے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ وہ بے انتہا محبت سے سرشار تھے۔ وہ کبھی غصہ میں بھی ایسا قدم نہیں اٹھاتے تھے جس سے اماں کو کسی قسم کی ذرا سی بھی تکلیف و رنج ہو۔ وہ بھلا ایسا قدم اٹھائے گا؟ اور اگر اٹھائے گا بھی تو کیا کسی باشعور انسان کو یہ یقین آسکتا ہے وہ اپنی ضعیف اور غمزدہ ماں کے لئے کوئی بھی خط یا نوٹ نہیں چھوڑ کر جائے گا؟ ان باتوں کے علاوہ جیسا کہ اوپر بھی کہہ چکا ہوں۔ خودکشی کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی۔ ایک اتنے سمجھدار ذہین اور ذمہ دار انسان کے لئے' جس کو اپنی بیوی بچوں' بھائی اور ماں سے اس قدر محبت اور لگاؤ ہو' جو ان کے خوشگوار مستقبل کے لئے کوشاں ہو اور جس نے بچوں کو باہر اس لئے بھیجا ہو کہ ان کے ذہن پر موجودہ حالات سے کوئی برا اثر نہ پڑے اور ان کی پرورش' تربیت' ذہنی نشوونما احسن طور پر ہو محض ایک جنسی اور وقتی خواہش کے لئے خودکشی جیسے سنگین عمل کا مرتکب ہونا تو کیا' سوچنا بھی ناممکن ہے۔ کیا اگر اسے خودکشی کرنی ہوتی تو وہ اس دن اور اگلے دن کے لئے

لوگوں کو ٹیلیفون کرنے اور ان سے ملنے کا وعدہ کرنا جو مصطفےٰ بھائی نے کیا تھا۔ انہوں نے ۲۰ اکتوبر کو بھی شاہد رضا سے یہ کہا تھا کہ وہ شام کو مصطفےٰ بھائی کو ٹیلیفون کرلیں تاکہ سوئمنگ کے لئے پروگرام طے کیا جا سکے۔ کیا خودکشی کرنے والے انسان کو اس کی فکر ہوگی کہ وہ اپنی کار کو دھو کر صاف کر کے گیراج میں کھڑی کرے۔ جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ مصطفےٰ بھائی نے ۲۱ اکتوبر کی صبح کو کار دھوئی تھی' پونچھا تھا اور گیراج میں کھڑی کی تھی۔ اس کے اس عمل سے اور جو لباس وہ پہنے پائے گئے ہیں' اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان تمام باتوں سے اور اس طرح کی بے شمار باتوں سے یہ یقینی طور پر اور بلا کسی شک اور شبہ کے کہا جا سکتا ہے کہ مصطفےٰ بھائی نے ہرگز ہرگز خودکشی نہیں کی۔ اس کے برعکس لوگوں سے باتیں کرنے اور معلومات حاصل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصطفےٰ بھائی کو قتل کر کے ختم کر دینے کے کئی اسباب ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ۸ اکتوبر کے ہفتہ وار "Mail" میں ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ شہناز بہت سے Boxes پاکستان سے باہر لے گئی تھی۔ جن کی نہ کوئی چیکنگ ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی تفتیش۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مصطفےٰ بھائی نے کئی لوگوں سے یہ کہا تھا کہ یہ خبر ان کی اطلاع دینے پر شائع ہوئی تھی۔ اس طرح مجھکو یہ بھی بتایا گیا ہے' جب شہناز انگلینڈ سے واپس آنیوالی تھی تو مصطفےٰ بھائی نے ائرپورٹ کسٹم والوں کو یہ اطلاع بھجوائی تھی کہ شہناز بہت سا سامان اسمگلنگ کرکے پاکستان لا رہی ہے۔ ان ہی ذرائع کے مطابق کسٹم والوں نے اس ائرکرافٹ اور اس کے مسافروں کی معمول سے زیادہ تلاشی بھی لی جس سے کہ شہناز آنے والی تھی۔ لیکن شہناز اپنے پروگرام کے خلاف ایک دن پہلے ہی پاکستان آگئی۔ اس کی اطلاع کہ مصطفےٰ بھائی نے کسٹم والوں کو ایسی خبر پہنچوائی تھی یقیناً" اسمگلنگ کے گروہ کو معلوم ہو گئی ہو گی۔ اسی طرح مجھ کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مصطفےٰ بھائی نے کچھ ایسے پمفلٹ چھپوائے تھے جس پر شہناز کی عریاں تصویر تھی اور جس میں اس کی ACTIVITIES اور اسمگلنگ کے گروہ سے رابطہ کا تفصیل سے ذکر تھا۔ بتایا گیا ہے کہ یہ پمفلٹ

پولیس نے مصطفےٰ بھائی کے مکان سے اپنے قبضہ میں لے لئے ہیں۔ میرے ایک دوست اشتیاق احمد نے جو یکم اکتوبر کو مصطفےٰ بھائی سے کراچی میں مل کر ایک سیمینار میں شرکت کے لئے برلن گیا ہے وہاں سے مجھے خط لکھا ہے۔ جسمیں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے خیال میں یہ لڑکی یعنی شہناز ایک بہت بڑے گروہ کی ممبر معلوم ہوتی ہے جس سے اسکے (اشتیاق) کے خیال میں مصطفےٰ بھائی کو بہت خطرہ ہے۔ اس لئے اشتیاق نے مجھے لکھا تھا کہ میں فاروق سے کہوں کہ وہ کسی نہ کسی طرح مصطفےٰ بھائی کو لاہور یا اسلام آباد بلا لے۔ اس خط کے ملنے کے بعد، تھوڑی ہی دیر بعد مجھے مصطفےٰ بھائی کے انتقال کی خبر ملی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس شخص کی بیوی بقول اس کے، دن کے تقریباً بارہ بجے سے گھر سے غائب ہو اس کو رات کے ڈھائی تین بجے تلاش کرنے کا خیال آئے اور جبکہ وہ وہاں پہنچ جائے جہاں اس کو یقین ہے کہ اس کی بیوی ہو گی۔ پھر بھی وہ صرف دروازہ کھٹکھٹا کر واپس چلا جائے اور پھر اگلی صبح دس سوا دس بجے تک بھی اس کی کوئی خبر نہ لے۔ بلکہ اس وقت آئے جب اس کے گھر اس کو کوئی لینے جائے۔ اس نے رات ہی کو پولیس وغیرہ کو اطلاع کیوں نہ دی۔ ایسے گروہ کو یقینی طور پر یہ بھی خدشہ ہو سکتا ہے جب مصطفےٰ بھائی کو اس گروہ کے متعلق بہت معلومات حاصل ہو چکی تھیں تو اگر مصطفےٰ بھائی جرمنی بھی چلے جاتے تب بھی وہ وہاں سے اس گروہ کو انٹرپول کے ذریعہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اگر ان تمام باتوں کا تجزیہ کر لیا جاتا اور کیمیکل رپورٹ بغیر کسی تاخیر کے مل جاتی اور جیسا کہ اخباروں میں شائع ہوا ہے کہ غلط لیبل وغیرہ لگنے کی وجہ سے شہناز کے معدہ سے نکلا ہوا مادہ واپس کر دیا گیا تھا اور پھر تین دن پڑے رہنے کے بعد کیمیکل ایگزامنر کو بھیجا گیا۔ اگر اس طرح کی تاخیر اور غلطیاں نہ کی جاتیں جن سے بے شمار شبہات پیدا ہوتے ہیں اور جیسا کہ سننے میں آیا ہے کہ مصطفےٰ بھائی کے جسم کے کپڑے کیمیکل ایگزامنیشن کے لئے بھیجنے کے بجائے کئی دنوں تک بھنگیوں کے پاس پڑے رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ ابتک پولیس بھی حتمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچ چکی ہوتی کہ یہ خودکشی کا نہیں بلکہ قتل کا کیس ہے"۔ (غیر مطبوعہ تحریری

بیان از ارتضیٰ زیدی)

پولیس اسٹیشن ڈرگ روڈ کراچی میں مصطفےٰ زیدی کی حادثاتی موت پر جو ابتدائی رپورٹ درج کروائی گئی اس میں بتایا گیا تھا کہ مصطفےٰ زیدی کے شہناز گل کے ساتھ جنسی مراسم تھے جس کا علم شہناز کے خاوند سلیم خان (۲۱) اور مصطفےٰ زیدی کے دوست فیاض ملک کو بھی تھا۔ ملازمت سے برطرفی کے بعد شہناز گل نے مصطفےٰ زیدی کے ساتھ سرد مہری برتی جس کا زیدی کو سخت رنج اور غصہ تھا۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۰ کو شہناز گل یورپ کے دورے سے واپس آئی تو مصطفےٰ زیدی نے اس سے ملاقات کی کوشش کی لیکن شہناز ملنے سے گریز کرتی رہی۔ مصطفےٰ زیدی نے شہناز گل سے بدلہ لینے کی خاطر ایک پریس سے چار ہزار پمفلٹ شائع کروائے جن میں شہناز گل کی دو عریاں تصاویر تیز شہناز اور اس کے خاوند کے علاوہ چند دیگر افراد کے متعلق فحش تحریری مواد تھا۔ ایک روز بعد مصطفےٰ زیدی نے فیاض ملک کو بتایا کہ شہناز گل سے ملاقات طے ہو گئی ہے۔ ۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی صبح دس بجے کے قریب شہناز گل کے ڈی اے اسکیم نمبر۱ میں آئی' جہاں کئی افراد نے اسے مصطفےٰ زیدی کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ دن کو شاہد رضا مصطفےٰ زیدی کے ہاں آئے اور نیچے سے آواز دی۔ مصطفےٰ زیدی بالکنی میں آیا تو بہت خوش نظر آرہا تھا۔ شاہد رضا نے اسے سوئمنگ کے لئے ائرپورٹ چلنے کو کہا تو مصطفےٰ زیدی نے معذرت چاہی اور وعدہ کیا کہ وہ کچھ دیر بعد ائرپورٹ پہنچ رہا ہے۔ عین اسی وقت ویرا زیدی کا خط جرمنی سے آیا۔ جو بعد میں پولیس کو مصطفےٰ زیدی کے کمرے سے دستیاب ہوا۔

شاہد رضا کے مطابق جب مصطفےٰ زیدی ائرپورٹ نہ پہنچا تو اسے وہاں سے ٹیلی فون بھی کیا گیا لیکن رابطہ قائم نہ ہو سکا۔

۳ اکتوبر کی صبح شفیق الرحمن اور ڈی ایس پی یونس جعفر سب سے پہلے وہاں پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند تھا جسے توڑ دیا گیا۔ ایک کمرے سے زیدی کی لاش ملی اور ملحقہ کمرے سے بے ہوش شہناز گل۔ شہناز کو طبی امداد پہنچانے کے بعد مصطفےٰ زیدی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے روزنامہ جنگ کراچی کے مطابق:

"پولیس کو بیان قلم بند کراتے ہوئے شہناز نے بتایا کہ مصطفےٰ حسنین زیدی جس وقت بی ڈی کے سکریٹری تھے' کراچی میں ڈیڑھ سال قبل ان سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔ تعلقات استوار ہو گئے اور آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ ہماری ملاقاتوں کا علم جب مرحوم کی جرمن بیوی کو ہوا تو دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اسی دوران زیدی زور دیتے رہے کہ میں ان سے شادی کر لوں۔ ان کا اصرار بڑھتا گیا تو ایک دن میں نے انھیں سمجھایا کہ تم بھی شادی شدہ ہو اور دو بچوں کے باپ ہو' میں بھی شادی شدہ ہوں اور دو بچوں کی ماں ہوں' گو تمہیں پسند کرتی ہوں لیکن دوستی سے آگے کوئی چیز نہیں چاہتی میں تم سے کبھی شادی نہ کر سکوں گی۔ ضد نہ کرو اسی میں بہتری ہے۔ شادی کے مسئلے پر ہم دونوں میں کئی بار تکرار بھی ہوئی۔ ناراضگی بھی ہوئی لیکن ہم جلدی پھر راضی ہو جاتے۔ انہوں نے کئی بار اصرار کیا کہ تم نے شادی نہ کی تو میری موت کی ذمہ دار تم ہو گی۔ مجھے یاد کر کے ٹی بی میں جتلا ہو جاؤ گی۔ میں ان باتوں پر ہنس کر خاموش ہو جاتی اور کہتی کہ تمہیں اپنی بیوی اور بچوں کا خیال کرنا چاہیے تم ان کے نہ ہو سکے تو میرے کیا ہو گے"۔

۱۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کی اخباری اطلاع کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی کنور اوریس کی عدالت میں عدالتی گواہ فارنزک سائنس لیبارٹری کے ڈی ایس پی غلام عباس نے بتایا کہ مصطفےٰ زیدی کے بستر سے جو بال ملا تھا وہ ملزمہ شہناز گل کے بالوں سے گہری مشابہت رکھتا ہے۔ عدالت میں مصطفےٰ زیدی کی سات ڈائریاں بھی پیش کی گئیں۔ اس سے قبل مصطفےٰ زیدی کے چھوٹے بھائی ارتضیٰ زیدی' شہناز گل کے چار محبت بھرے خطوط کی فوٹو کاپیاں عدالت کو مہیا کر چکے تھے۔ ارتضیٰ زیدی نے عدالت میں تین مقامی انگریزی روزنامے اور ایک انگریزی رسالہ بھی پیش کیا جن میں کراچی کی کسی تقریب میں اتاری گئی سینٹو پیر بھائی اور شہناز گل کی تصاویر شائع ہوئی تھیں۔ عدالت میں کاغذ کا ایک پرزہ بھی پیش کیا گیا جس پر شہناز گل نے لکھا تھا:

"سوچا تھا کیا' کیا ہو گیا۔۔۔۔افسوس ہے' سمجھے تھے ہم' اپنا جسے' اپنا نہ تھا"

۵ نومبر ۱۹۷۱ء کو کنور ادریس کی عدالت میں استغاثہ کے گواہ اور سی ڈی اے اسلام آباد کے ڈپٹی ڈائریکٹر اشتیاق احمد نے اپنے بیان میں عدالت کو بتایا کہ مصطفےٰ زیدی ان کا دوست تھا۔ انہیں ۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو برلن کے ایک سیمینار میں شرکت کرنا تھی۔ برلن جاتے ہوئے کراچی میں مصطفےٰ زیدی سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران میں جرمنی سے ویرا زیدی کا ٹیلی فون آیا۔ مصطفےٰ زیدی نے بچوں کی خیریت پوچھی تو اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر دونوں دوستوں نے "کیفے گل بہار" میں کھانا کھایا۔ گفتگو کے دوران مصطفےٰ زیدی نے کہا:

"اب فیصلہ ہو گیا"۔

اس وقت تو اشتیاق احمد کچھ نہ سمجھے لیکن بعد میں مصطفےٰ زیدی کی خودکشی نے اس فیصلے کی وضاحت کر دی۔ کیفے گل بہار سے واپسی پر پاکستان چوک کی یادگار سے مصطفےٰ زیدی نے سات آٹھ "ڈیلی میل" خریدے۔ اتنی تعداد میں پرچے خریدنے کا سبب' مصطفےٰ زیدی نے ایک خبر پڑھ کر سنائی" خبر کی سرخی تھی:

"Now Sports Promotion Bureau in Smiling Racket"

خبر کی تفصیل یہ تھی کہ بنگلور کی ایک خاتون برلن کے تجارتی میلے میں پاکستانی اسٹال لگانے گئی تھی اور اس نے اس محکمے کی مدد سے جو رقم کمائی تھی پاکستان نہیں بھیجی تھی۔ وہ خاتون شہناز گل تھی۔ مصطفےٰ زیدی نے بتایا کہ اس کے شہناز گل کے ساتھ تعلقات رہے ہیں اور شہناز اس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر برلن (جرمنی) سے واپسی پر اس سے نہیں ملی اور اب ایک بڑے سیٹھ پیر بھائی کی داشتہ ہے۔ مصطفےٰ زیدی نے بتایا کہ شہناز گل اور پیر بھائی سمگلروں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور شہناز نے اب پیر بھائی کے کہنے پر اس سے اپنے فوٹو اور خطوط واپس مانگے ہیں۔

یہ سن کر اشتیاق احمد نے زیدی کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا تو مصطفےٰ زیدی نے اپنے گھر کی الماری سے پستول نکالتے ہوئے کہا کہ اگرچہ وہ کافی محتاط ہے' لیکن بزدل بھی نہیں۔

اشتیاق احمد نے یہ دیکھ کر مصطفےٰ زیدی کو سمجھایا بجھایا۔ جس پر وہ فاروق صاحب کو لاہور سے اپنے پاس بلانے پر رضا مند ہو گیا۔ لیکن جب ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو اشتیاق احمد برلن سے واپس کراچی پہنچے تو ہوٹل میں انہیں ایک چٹ ملی جس پر مصطفےٰ زیدی کی موت کی خبر تحریر تھی۔ یہ تحریر ویرا زیدی نے انہیں بھجوائی تھی جو زیدی کی موت کی خبر سنتے ہی جرمنی سے کراچی پہنچی تھیں۔

۱۵ نومبر ۱۹۷۰ء کے روزنامہ "مشرق" لاہور کے مطابق سیشن جج نے شہناز گل کی طرف سے پیش کی گئی ضمانت کی درخواست مسترد کر دی۔ جج نے لکھا تھا کہ ملزمہ کو مارشل لاء کے ضابطہ ۲۳ کے تحت گرفتار کیا گیا ہے' جس کا تعلق سمگلنگ سے ہے اور اس پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کے تحت قتل کا الزام بیان کیا جاتا ہے۔ جج نے وضاحت کی کہ اگر دفعہ ۳۰۲ کے تحت ریمانڈ کے بغیر گرفتاری غیر قانونی تصور کی جاتی ہے تو کسی بھی مجاز عدالت میں حبس بے جا سے رہائی کے لئے رٹ درخواست دائر کی جا سکتی ہے۔

عدالتی کارروائی کے دوران مزید تفتیش کی خاطر ایک بار پھر مصطفےٰ زیدی کی لاش کا طبی معائنہ کیا گیا۔ اس پراسرار موت کے مقدمے کی خبریں اخبارات کی سرخیاں بنتی رہیں اور پھر تقریباً" دو سال بعد ۲۶ مئی ۱۹۷۲ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کنور ادریس کی عدالت نے شہناز گل کو بری کر دیا۔ بعد میں ایک اپیل پر مقدمے کی تحقیق دوبارہ بھی ہوئی لیکن دوسری بار بھی شہناز گل کو بری قرار دیا گیا۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق مصطفےٰ زیدی نے خودکشی کی تھی۔

○

حوالہ جات و حواشی:

(۱) احمد رضا اس زمانے میں انکم ٹیکس آفیسر تھے۔ بعد میں انکم ٹیکس کمشنر بنے' ان کا انتقال ۱۹۳۷ء میں ہوا۔

(۲) بہ حوالہ "میرے بچپن کا ساتھی" مشمولہ "نقش" کراچی زیدی نمبر
(۳) یہ مضمون پہلے انگریزی میں لکھا گیا۔ مجاز کی وفات کے بعد اردو کے قالب میں ڈھلا۔ مشمولہ "افکار" کراچی زیدی ایڈیشن اکتوبر ۱۹۷۰ء
(۴) بہ حوالہ "مجاز' نورا' شمیم' امیر بھائی اور میں" مطبوعہ "افکار" کراچی مجاز نمبر
(۵) سروج بالا سرن الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شنکر سرن کی بیٹی تھی۔
(۶) بہ حوالہ "مجاز' نورا' شمیم' امیر بھائی اور میں" مطبوعہ "افکار" کراچی مجاز نمبر
(۷) بہ حوالہ "چراغ آفریدم" دیباچہ "روشنی" از مصطفےٰ زیدی
(۸) بہ حوالہ "تیغ الہ آبادی سے مصطفےٰ زیدی" مطبوعہ "نقش کراچی زیدی نمبر
(۹) مصطفےٰ زیدی کے چھوٹے بھائی ارتضیٰ زیدی کے مطابق زیدی جنوری ۱۹۵۲ء میں پاکستان منتقل ہوئے۔
(۱۰) بہ حوالہ "ایک تھا راجہ" از مسعود اشعر' مطبوعہ "نقش" کراچی زیدی نمبر' مارچ اپریل ۱۹۷۱ء
(۱۱) بہ حوالہ "کچھ یادیں کچھ باتیں" از احمد علی سید' مطبوعہ "افکار" کراچی زیدی ایڈیشن
(۱۲) بہ حوالہ "میرے بچپن کا ساتھی" از ابن صفی مطبوعہ "نقش" کراچی زیدی نمبر
(۱۳) بہ حوالہ "ایک تھا راجہ" از مسعود اشعر مطبوعہ "نقش" کراچی" زیدی نمبر
(۱۴) بہ حوالہ "تجھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں" از مصطفےٰ زیدی
(۱۵) بہ حوالہ مقدمہ "موج مری صدف صدف" از مصطفےٰ زیدی
(۱۶) فتح خان بندیال ۱۹۷۰ء میں سیکرٹری وزارت محنت اور افرادی قوت' حکومت پاکستان تھے۔
(۱۷) مصطفےٰ زیدی کے بیٹے کا نام مجتبیٰ ہے جسے گھر والے پیار سے منجو پکارتے ہیں
(۱۸) بہ حوالہ "حرف آخر" مشمولہ کوہ ندا
(۱۹) بہ حوالہ "نقش" کراچی زیدی نمبر
(۲۰) ایضاً
(۲۱) روزنامہ "جنگ" کراچی مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے مطابق سلیم خان' کراچی

جیمخانہ کلب کے باقاعدہ ممبر تھے۔

☆

سب سے بڑی عدالت

یہ شاعری مری سب سے بڑی عدالت ہے
مصطفٰے زیدی

ہلڈرلن نے شعر گوئی کے متعلق کہا تھا کہ یہ سب سے معصومانہ مشغلہ ہے۔ اس لیے کہ شعر گوئی حقیقت پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتی' یہ عمل نہیں ہے' یہاں شاعر کو فیصلے نہیں کرنے پڑتے' جن کے ذریعے جرم یا گناہ کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔ خود ہائیڈگر بھی اسی نتیجہ پر پہنچا تھا۔ سو جب جرم یا گناہ کا امکان ہی ختم ہو گیا تو ہمیں چاہیے کہ مصطفٰے زیدی کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت محتاط رہیں اور کسی حد تک سنگدل بھی کہ شاعر سے رُو رعایت کا الزام نہ آنے پائے۔ یوں بھی شاعری کے طرف داروں میں کوئی تو ہونا چاہیے سو کرنہ شاعر بہت ہیں اور ایک سے ایک ظالم۔

مصطفٰے زیدی کا نظریہ شعر تھا:

"بغیر انسپریشن شعر لکھنا ہمارے اوپر حرام ہے۔ رنگ اور صوت اور ہیجان اور دھندلکے تو ذہن میں ہر وقت قائم رہتے ہیں لیکن ان سے تصویریں اور قوسیں اس وقت بنتی ہیں جب سورج کی کوئی کرن ان پر پڑتی ہے" (مکتوب بنام ابن انشاء)

دیکھا جائے تو ۲۰ ویں صدی کا تیسرا عشرہ خصوصاً" ہندوستان میں ادبی رجحانات سے قطع نظر سیاسی' اقتصادی' معاشی اور معاشرتی لحاظ سے بھی بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا ہے۔ جبکہ مصطفٰے زیدی کی شاعری کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اگر اس دور کے ادبی منظرنامے پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے چلیں تو مصطفٰے زیدی اور اس کی شاعری کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

انقلابات کے اس عہد میں اقتصادی' معاشی اور معاشرتی اقدار کی تبدیلی کے ساتھ اردو ادب میں خارجیت اور حقیقت پسندی کا رجحان عام ہوا اور نئے نئے موضوعات کی تلاش کے ساتھ اسالیب بیان اور ہیت کے نت نئے تجربے ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے لندن میں مرتب کیے گئے پہلے اعلامیے

میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے تبدیلی کے احساس پر زور دیا۔ خاندان' مذہب' جنس' جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی سے انکار کیا اور بھوک' افلاس' سماجی پستی اور غلامی کو بنیادی مسائل بتایا۔ اس زمانے میں "حلقۂ ارباب ذوق" کے جدید شعراء کا ایک گروہ ابھر کر سامنے آیا۔ ان شعراء نے فرانسیسی شاعری کے زیر اثر تحت الشعور کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع قرار دیا اور پھر دیکھتے دیکھتے ملارمے' رامبو' ورلن اور بودلیر کے اثرات قبول کرنے والے شعراء کو شمار کرنا دشوار ہو گیا۔

ترقی پسند ادب اور حلقۂ ارباب ذوق کی ان دو بڑی تحریکوں کے ساتھ ساتھ رومانی رویے بھی جاری و ساری تھے۔ یہ رویے ان تحریکوں کے اندر بھی تھے اور ان سے باہر بھی۔ رومانی شعراء خصوصاً" اختر شیرانی' حفیظ جالندھری' مجاز لکھنوی' احسان دانش اور جگر مراد آبادی پورے ادبی پیش منظر پر چھائے ہوئے تھے۔ اور بقول مصطفےٰ زیدی یونگ کرسچین کالج اور الہ آباد یونیورسٹی (جہاں سے اس نے تعلیم پائی) محض تعلیمی ادارے نہ تھے بلکہ تربیتی مراکز بھی تھے۔ جن میں ہر طرح کے خیال کو برداشت کرنے کی صلاحیت تھی۔

مصطفےٰ زیدی نے ۱۹۴۲ء میں باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا۔ اس کی ابتدائی شاعری خصوصاً" پہلی کتاب "زنجیریں" میں ایک خیالی جنت کی جستجو ہے جو اس دنیا سے بہت مختلف ہے اس کے اپنے انسانی روابط ہیں اور زندگی کے اپنے اصول۔ اس جنت میں قاری ایک معصوم اور شرمیلے بچے کی طرح قدم رکھتا ہے۔ ہر چیز کو ٹُکٹُک کر دیکھتا ہے۔ اس کا ہر عمل جنت کے ساتھ رشتہ مضبوط کرتا ہے۔ ہر عمل خیر کا عمل ہے لیکن یہ جنتی لمحات بہت مختصر ہیں' بالکل ایک خواب کی مانند جس کے ختم ہو جانے پر اپنی دنیا میں آنے کو جی نہیں چاہتا۔

فراق گورکھپوری نے "زنجیریں" کے قطعات کے بارے میں لکھا تھا:

"ان قطعات کی زبان اتنی فطری اور بے تکلف ہے کہ ان کا نثر کرنا مشکل نہیں۔ یہ مجموعہ ایک نرم و نازک شاخ ہے' جس کے ہر پیچ و خم میں سفید' گلابی اور کئی ہلکے رنگ کی (پھیکے رنگ نہیں) کلیاں آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی ہیں"۔

کتنی رنگین رت یہ آئی ہے
کھل اٹھے پھول ہنس پڑے گلشن
گاؤں سے خط لکھا ہے انجم نے
تم بھی آؤ کہ آ گئے ساون

ایک خط

یوں ہی ناراض ہو گئے مجھ سے
من کے مالک مری بھی بات سنو
میں تمہیں ایک پل بھی گر بھولوں
تم مجھے عمر بھر نہ یاد کرو

شکوۂ خلوص

مدتوں بعد ہوا میرا گزر اے ہمدم
اس جگہ جس کو ملک مہر کہیں ماہ کہیں
مجھ سے روٹھی ہوئی آواز میں انجم نے کہا
اب بھی کیوں آئے یہاں کس نے بلایا تھا تمہیں

پھر یکایک ترقی پسند تحریک نے مصطفےٰ زیدی کو نیا لہجہ دیا اور بغاوت پر اکسایا۔ سو دوسرے شعری مجموعے "روشنی" میں صرف روشنی ہی نہیں حرارت بھی محسوس ہوتی ہے۔

مجموعہ "روشنی" پہلی بار ۱۹۴۹ء میں مکتبہ حیات نو ـــــ الہ آباد (یوپی) سے شائع ہوا۔ سرورق کا رنگ سرخ تھا جس پر ہتھوڑے اور درانتی کے نشانات سے "روشنی" لکھا تھا۔ کتاب پریم کمار جین کے نام کی گئی تھی۔ روشنی کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں آیا جب تیغ الہ آبادی، مصطفےٰ زیدی میں بدل گیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن مکتبہ ادب جدید ــــ چوک مل روڈ لاہور نے شائع کیا۔

دوسری اشاعت میں کچھ ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے اب اس میں پینتالیس غزلیں

اور نظمیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام بقول مصطفےٰ زیدی ۱۹۵۸ء کی تخلیق ہیں۔

"جب غم غم کی طرح اور خوشی خوشی کی طرح تھے۔ جدلیات" جمالیات اور ادب کے دیگر کئی موضوعات پر بحثیں ہوتی تھیں۔

"یہ طالب علمی کا زمانہ تھا جب محض تجربے کے لئے آدمی بڑی بڑی تحریکوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب متوقع باتیں غیر متوقع طور سے ہوتی رہتی ہیں اور جب نئے جذبات کی آہٹ سے سارا وجود سنسناتا رہتا ہے۔ اسے ابھی ذہنی رکھ رکھاؤ نصیب نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ اس افتاد طبع سے جو شعر نمودار ہوتے ہیں ان کا اپنا رنگ ہوتا ہے بلکہ آگے چل کر اسی رنگ کو شاعر ترستا رہ جاتا ہے اور یہ دوبارہ نصیب نہیں ہوتا" (مقدمہ ـــــ روشنی)

"روشنی" کی تمام نظمیں پابند ہیں۔ نظم "روشنی" ان لوگوں سے خطاب ہے جو نئی نسل کو اچھا نہیں کہتے جبکہ "کرن" میں نئے عہد اور انقلاب کی بشارت ہے۔

یہ ابر کے طوفاں یہ کہرا یہ دھواں چھٹ جائے گا

"نظم گستاپو" سفید پوش لیکن سیاہ دل گستاپو سے خطاب ہے جس کی غذا میں راہ حق کے شہیدوں کا خون شامل ہے۔ "شطرنج" رقیب سے خطاب ہے' رقیب جس کے ہاتھ بساط ہے اور جو ساری کھیل پر اپنی مکاری سے چھا چکا ہے:

ابھی جو کل مرے دکھ درد کا مداوا تھی
وہ آج تیری شریکِ حیات ہے ساتھی
(شطرنج)

ایسے میں اس عہد کا رومانی لحن بھی عود کر آتا ہے۔

پتہ نہیں کہاں ہو یارو
ہماری افتادِ روز و شب کی
تمہیں خبر مل سکی کہ تم بھی
رہینِ دستِ خزاں ہو یارو
ابھی لڑکپن کے' حوصلے ہیں

کہ بے سرو سائباں ہو یارو
تمہاری یادوں کے قافلے کا
تھکا ہوا اجنبی مسافر
ہر اک کو آواز دے رہا ہے
خفا ہو یا بے زباں ہو یارو
(آواز کے سائے)

یہی وہ زمانہ ہے جب لڑکپن کے مذہبی جنون کے ردعمل کے طور پر مصطفےٰ زیدی کے ہاں خدا سے منکر ہونے کا رویہ نمایاں ہوا' اس لیے جب جوش ملیح آبادی ایک طرف "پڑھ کلمہ لا الہ الا انساں" اور دوسری طرف "ہم رند بھی ہیں حلقہ ماتم میں اسے حسین" کہتے ہیں تو اس تضاد کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔

یوں تو بڑی اور نمایاں آوازوں کی گونج پورے ہندوستان میں تھی لیکن مصطفےٰ زیدی کو اس زمانے کی رومانوی فضا (جس میں عشق ایک زندہ حقیقت تھی) کے ساتھ جوش اور مجاز لکھنوی کی باغیانہ خطابت بہت پسند آئی۔ یہی وجہ ہے کہ "زنجیریں" اور "روشنی" میں تمام تر اور "شہر آذر" میں وہ کسی حد تک جوش اور مجاز کے رنگ میں رنگا نظر آیا۔ "شہر آذر" کی تشبیہات و استعارات' بلند و بانگ و درشت لہجہ اور خطیبانہ انداز انہی دو شاعروں کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

"شہر آذر" کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۵۸ میں لاہور اکیڈمی لاہور نے شائع کیا۔ کتاب ویرا فان مل کے نام کی گئی ہے جو اس کتاب کے شائع ہونے تک ویرا زیدی بن گئیں۔ مصطفےٰ زیدی نے اس مجموعے میں ۲۰ غزلیں اور ۴۹ نظمیں شامل کی ہیں جن کے بارے میں مصطفےٰ زیدی نے لکھا ہے:

"یہ نظمیں اور غزلیں میری نہیں ہیں' بلکہ تیغ الہ آبادی کی ہیں۔ تیغ الہ آبادی اور میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ایک ہی تھے لیکن آخر انھیں علاحدہ ہونا ہی پڑا۔ اس تخلص کی قصابیت کو میں نے بچپن کی غلطیوں میں شامل کر رکھا تھا' لیکن آخر تخلص کے بغیر بھی گزر ہو ہی سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی تخلص کے علاوہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ مصطفےٰ زیدی سے ابھی تک میں ہی مانوس نہیں ہوا ہوں' آپ کو شاید

اور بھی مدت درکار ہو"۔

"شہرِ آذر" کا شاعر اس کوشش میں غلطاں دکھائی دیتا ہے کہ احساس اور جذبہ کے براہ راست اظہار کے بجائے تمثالوں کے ذریعے بات کرے۔

زندگی، آج تو کسی طرف آگئی
صبح کی سیپیا روشنی چھوڑ کر
مدھ بھری شام کی کمسنی چھوڑ کر

پیڑ کے روپ میں کوئی دشمن نہ ہو
پاس کے موڑ پہ کوئی رہزن نہ ہو
یہ کھنڈر کوئی روحوں کا مسکن نہ ہو
(یہ آدمی کی گزرگاہ)

بعض مقامات پر تمثال کاری اور خطابت آپس میں اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

لمبی چوڑی سڑک کے دامن پر
قمقمے سہمے سہمے جلتے ہیں
جیسے اکثر بڑے گھرانوں میں
فاقہ کش رشتہ دار پلتے ہیں
(نظم: مری کی ایک شام)

یہ چاند کے خوشگوار چہرے کے گرد اتنے اداس ہالے
یہ دور سے نو عروس کمرے، یہ پاس سے مکڑیوں کے جالے
اڑان کے بعد اس کا رونا کہ بال و پر میں تو کچھ نہیں ہے
یہ سرج کے سوٹ اور یہ سوچنا کہ گھر میں تو کچھ نہیں ہے

ان تصویروں میں خود ترحمی ہے، رومانوی خواب کی تضا ہے اور معاشرتی شعور کے ساتھ طنزیہ لہجہ بھی۔ رومانوی نصب العین اور گردوپیش کی حقیقت کا تضاد "شہر

آذر" کی بیشتر نظموں کی پہچان ہے۔

سیاہ آنکھوں کے بدلے جواں لبوں کے عوض
ہر ایک شکل کھڑی تھی کوئی دکان سجائے
ہر ایک شکل سے آتی تھی دم بدم آواز
گھڑی، پرانی قمیض، دوائیں، سگرٹ چائے
(نظم: آئینہ خانۂ تصور میں)

بقول مصطفےٰ زیدی اس نظم کا مرکزی کردار ایک ہی ہے جس میں دو شخصیتیں ایک دوسرے سے الجھتی ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں تھک کر ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اس کشاکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی رشتوں میں جس آئینہ جمال کی وجہ سے استواری ہے وہ چکنا چور ہو جاتا ہے اور چہرہ اپنی بنیادی کثافت میں نمایاں ہونے لگتا ہے۔

"شہرِ آذر" کی نظموں میں رومانی شاعری کی خصوصیات مثلاً" اسم معرفہ کے استعمال اور مقامی رنگ کے ساتھ خطابت کا عنصر بھی نمایاں ہے جبکہ تفاصیل میں رومانوی حقیقت پسندی دکھائی دیتی ہے۔

اگر پھر اس بار جنگ ہوگی
تو آدمیت نکیلے بوٹوں کی ٹھوکروں سے لرز اٹھے گی
تمہارے گھر کے برآمدے میں چٹختی اینٹوں کے ڈھیر ہوں گے
تمہارے چھجے پہ کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے نہیں رہیں گے
تمہارے آنگن کی رسیوں پر سفید کپڑے نہیں رہیں گے
(نظم: میں امن چاہتا ہوں)

مصطفےٰ زیدی کا یہ رومانوی حقیقت پسندی میں رچا بسا ہوا مقامی رنگ اور خطابت کا جوہر ہمیں رفتہ رفتہ جنگ سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جبکہ اس نوع کی رومانوی حقیقت پسندی اور مقصدی شاعری سے گریز کی پہلی صورت نظم "غرب اسٹریٹ کی کہانی" ہے۔

ہم جاگتے رہے تو کلی بھی نہیں کھلی
ہم سو گئے تو سر سے قیامت گزر گئی

☆

جب بھی کسی حسینہ نے جھٹکے سیاہ بال
کتنے جوان مر گئے انداز دیکھ کر

☆

خواجہ کا کیا قصور اگر سارے اولیاء
اس سمت آنکلتے تو صر صر کو دیکھ کر
اک دوسرے کی آنکھوں میں ناخون مارتے
اک دوسرے کی پشت میں چھریاں اتارتے
(نظم : کرب اسٹریٹ کی کہانی)

اس نظم میں شاعر کا ذہن آزاد ہے' تاہم اس تخیلاتی آزاد روی میں آزاد تلازمہ کا اسلوب بھی ہے اور طنز کی کاٹ بھی۔ شاعر کے مزاج کی جذباتی رو' جو اس کی بیشتر رومانی اور مقصدی نظموں میں ملتی ہے' اس نظم میں نہیں ہے۔ البتہ مزاج کی تلخی صاف عیاں ہے۔

"شہر آزر" کی غزلوں میں نئے پن کی جستجو بلاوجہ نہیں کی گئی۔ ان غزلوں میں تازگی اس لیے ہے کہ شاعر حال کے لمحے میں زندہ رہتے ہوئے اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ ان اشعار میں زندگی کا شعور' تاجرانہ ذہنیت کے فروغ کا دکھ اور اقدار کی بے قدری کا احساس نمایاں ہے۔

اتنے ربط' اتنی شناسائی کے بعد
کون کس کے حال کا محرم رہا

☆

جو دن گزر گئے ہیں ترے التفات میں

میں ان کو جوڑ لوں کہ گھٹا دوں حیات میں
کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی مرے واقعات میں
میرا تو جرم تذکرہ عام ہے مگر
کچھ دھجیاں ہیں میری زلیخا کے ہات میں

☆

دل کے رشتے عجیب رشتے ہیں
سانس لینے سے ٹوٹ جاتے ہیں

☆

بڑے خلوص سے احوال پوچھنے کے لئے
گزر گئی شبِ فرقت تو میرے یار آئے

☆

روح کے اس ویرانے میں تیری یاد ہی سب کچھ تھی
آج تو وہ بھی یوں گزری، جیسے غریبوں کا تیوہار

"شہرِ آزر" کی آخری نظم "رفتگاں" ہے:
زمانہ ختم ہو گیا
لہو میں تھا جو رقصِ والہانہ ختم ہو گیا

یہ لہو کے رقصِ والہانہ کا خاتمہ مصطفےٰ زیدی کی شاعری کے پہلے دور کا خاتمہ ہے۔ اس اولین دور کا معاشرہ داخلی اور خارجی طور پر فرسودہ رسوم و رواج، داخلی و جذباتی جکڑ بندیوں اور سامراجی جبریت کا شکار تھا، اور اس معاشرے کے خلاف بر سر عمل "بغاوت" اور عشق" تخلیقی اعمال تھے۔ ایسے میں شاعر اپنی ذات کے الجھیڑوں میں نہ الجھا تھا، بلکہ اس کوشش میں تھا کہ اپنے گرد و پیش کے فرسودہ پن کے خلاف آواز بلند کرے۔ یعنی اندر کی جنگ کے بجائے باہر جنگ ہو رہی تھی"۔ ڈبلیو۔ بی ییٹس

کا کہنا ہے "دنیا سے جنگ کرنے میں خطابت پیدا ہو رہی ہے۔" سو اس زمانے میں ایسا ہی ہوا اور ایسی شاعری کا قبول عام حاصل کرنا لازمی امر تھا۔ مصطفےٰ زیدی کی شاعری کا ڈنکا بجنے لگا۔ لیکن زیدی انقلابی ہونے کے ساتھ رومانی بھی تھا اور اسے عمر بھر یہ رومانیت عزیز رہی۔ "شہر آذر" تک کی شاعری میں جذبے کے مقابلے میں فکری عناصر کی کمی ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ زمانہ جذبی کی "طوائف" ساحر کی "تاج محل" اور مجاز کی "آوارہ" کا زمانہ ہے۔

یوں مجاز اور اختر شیرانی کی Teen Agers Poetry کی روایت کو سنبھالا دینے اور آگے بڑھانے والوں میں مصطفےٰ زیدی کا نام بھی آتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب اس نے تیغ الہ آبادی کہلانا پسند کیا۔

انگریزی کے رومانی شعراء کے متعلق جو فقرہ بار بار سننے میں آتا ہے کہ "ان کی زندگی کم تھی لیکن ان کی زندگی میں شدت زیادہ تھی" یہ زیدی پر بھی پورا اترتا ہے۔ مصطفےٰ زیدی کے نزدیک آنے والا وقت اور حال کا لمحہ عذاب سے کم نہیں اسی طرح وہ بائرن، شیلے، اور کیٹس کی طرح کا باغی نظر آتا ہے اور سدا سے پریشان حال روح ـــــ مروجہ اصولوں کو ماننے سے انکاری۔

مذہب اور خدا کے بارے میں اس کے تصورات باغیانہ ہیں۔ قوت اس کے نزدیک بڑی حقیقت ہے۔ وہ روسو کا ہمنوا رہا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے"۔ زیدی اس کھلی بغاوت کے بعد دیگر رومانویوں کی طرح اپنی الگ بستی کا باسی رہا یہ بستی خواب کی بستی ہے جو اس کی ذات کے گرد ایک حصار بھی ہے۔ اسی حصار کے ٹوٹنے سے معاشرتی شعور جنم لیتا ہے اور حقیقت اور خواب کا تضاد واضح ہوتا ہے۔

زمانہ ختم ہو گیا
لہو کا رقص والہانہ ختم ہو گیا

لیکن یہ سب یکلخت نہیں ہوا۔ "گریبان" کے چھپنے تک مصطفےٰ زیدی پوری طرح مارکسی بن کر سامنے آیا تھا۔ لیکن اس نے دیکھنے کے لیے محض چند روزن نہیں کھول رکھے تھے۔ اس کی نظر تمام تر سیاسی اور سماجی نظام پر تھی، اور اس کا ثبوت "مری چھر

آنکھیں" "اعتراف" "جلوس رسوائی" "کوہ ندا" اور "مارشل لاء سے مارشل لاء تک" جیسی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں اس کے ترقی پسندانہ خیالات ایک ایسے عالمگیر لہجے میں ڈھلے کہ اس کی شاعری محض ہنگامی اور وقتی نہیں رہ گئی۔

زمیں نئی تھی فلک ناشناس تھا جب ہم
تری گلی سے نکل کر سوئے زمانہ چلے
نظر جھکا کے باندازِ مجرمانہ چلے
(قبائے ساز)
اک پیشۂ عشق تھا سو عوض مانگ مانگ کر
رسوا اسے بھی کر گئی سوداگروں کی ذات

مصطفےٰ زیدی نے "کوہ ندا" تک آتے آتے یہ جان لیا تھا کہ اشتراکی حقیقت نگاروں نے ترقی پسند ادب کی تخلیق کے لیے جو فارمولا ایجاد کیا تھا وہ جان برگر کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہے کہ پہلے خالص نظریاتی DOGMA کے مطابق ایک مصنوعی فرضی واقع کا چناؤ کرو' پھر اس میں زیادہ سے زیادہ NATURALISM کا رنگ بھرو تاو قتیکہ ایسا نظر آئے کہ واقعہ زندگی سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیشن پرست ترقی پسندوں کی تخلیقی سرزمین حقیقی تجربوں کی گزرگاہ نہیں بن پائی۔

یہ سب اپنی جگہ لیکن "موج مری صدف صدف" تک آتے آتے مصطفےٰ زیدی کی رومانیت نے تلخ حقائق کو بطور حقیقت تسلیم کر لیا تھا۔

چوتھا مجموعہ کلام "موج مری صدف صدف" پہلی بار فروری ۱۹۶۰ء میں لاہور اکیڈمی سرکلر روڈ لاہور نے شائع کیا۔ اس مجموعے کی اکثر نظمیں قیام انگلستان یا سفر یورپ کی یادگار ہیں۔ اس ضمن میں زیدی نے خود لکھا ہے:

"میں نے جو تھوڑی بہت دنیا دیکھی ہے اور اپنوں اور غیروں کے ساتھ گزاری ہے' اس سے میرے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ محض مشرق کی دہائی دے کر کوئی نہ کوئی نقاد اس مجموعے کو بغیر پڑھے بدنام کر سکتا ہے بلکہ ایک چھوٹے سے پیمانے پر ایسا ہوا بھی ہے۔ ایک صاحب نے جو کئی اخباروں رسالوں کے مدیر اور شاعر مضمون نگار وغیرہ وغیرہ ہیں مجھے خط میں لکھا تھا کہ "آپ نے" شکست فرار' انتقام"

والی نظم میں اپنے اسی زمین کے دوستوں کا جو مذاق اڑایا ہے وہ نہ آپ کو زیب دیتا ہے نہ آپ کے حق میں اچھا ہے۔ بہرحال "شریکِ حیات" (یہ نظم "شہر آذر" میں شامل ہے) کی بات بھی چونکہ درمیان میں آگئی ہے اس لیے آپ کو صرف مبارک باد دیتا ہوں۔۔۔۔۔۔ "میرے حق میں اچھا نہ ہونے والی جو دھمکی ہے اس کے تو نہ جانے کیا معنی ہیں' لیکن اتفاق دیکھیے کہ "شریکِ حیات" عنوان کی نظم میں نے یورپ جانے سے چھ سال قبل لکھی تھی۔ اسی طرح اور بھی چند اصحاب نے میرے یورپ کے ردعمل ان نظموں میں ڈھونڈے ہیں' جو کافی عرصے پہلے کی ہیں۔ ایمانداری کی بات تو یہ تھی کہ میں ان تمام نظموں' غزلوں پر تاریخ درج کر دیتا لیکن اس طرح ایک لطف سے محروم ہونے کی گنجائش نکل آتی"۔

(دیباچہ سے اقتباس)

اب اس کی نظموں کے عنوانات اسی طرح کے ہونے لگے جیسے "فرار' شکست' انتقام وغیرہ وغیرہ ہے۔ بقول سجاد باقر رضوی " اس وغیرہ وغیرہ" پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ فرار شکست اور انتقام جو فی الحقیقت لہو کے رقص والہانہ اور احساس طبیعت کی خصوصیت ہیں۔ اب محض وغیرہ وغیرہ بن گئے ہیں یہ ایک تلخ استہزا ہے' خود پر بھی اور دوسروں پر بھی۔

مصطفےٰ زیدی کے یہاں اس وقت بھی تلخی کی رمق موجود تھی جب وہ تیغ الہ آبادی تھے۔ مگر اب تیغ الہ آبادی کی عصبیت' ان کی باغیانہ طبیعت' ان کی رومانوی جذباتیت مصطفےٰ زیدی کے شعور حقیقت' ٹھوس دنیوی معاملات اور ان کی طبیعت کے ٹھہراؤ اور سکون سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی تھی۔ مصطفےٰ زیدی نے تیغ الہ آبادی کو خود میں جذب کر لیا اور اس کا نتیجہ ایک مقابلتاً" بالغ معروضیت کی صورت میں ظاہر ہوا۔(۱)

نظم "ماہیت" چار اشعار پر مشتمل ہے' جس کے پہلے تین اشعار تیغ الہ آبادی کے ترجمان ہیں اور آخری شعر مصطفےٰ زیدی کا ترجمان۔ آخری شعر میں رومانوی عصبیت پسندی کی نفی ہے۔

میں سوچتا تھا کہ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں

افق کی موج پہ بکھرا ہوا ہلال ہو تم
تصورات میں تم نے کنول جلائے ہیں
وفا کا روپ ہو' احساس کا جمال ہو تم
کسی کا خواب میں نکھرا ہوا تبسم ہو
کسی کا پیار سے آیا ہوا خیال ہو تم
مگر یہ آج زمانے نے کر دیا ثابت
معاشیات کا سیدھا سا اک سوال ہو تم

یہ تلخی ایک طرف تو رومانوی نصب العین کی شکست اور گردوپیش کی دنیا سے جبری سمجھوتے کے باعث وجود میں آئی اور دوسری طرف اس کی وجہ وہ بالغ نظری ہے جو تیغ سے مصطفےٰ زیدی تک کے سفر کی عطا ہے' جس کے سبب شاعر حقیقت کی ایک سے زیادہ سطحیں اور صورتیں دیکھ سکتا ہے۔

مشرق کے پنڈت' مغرب کے گرجا والے
صبح ہوئی اور سچائی کے پیچھے بھاگے
سچائی اک قحبہ تھی جو رات کو تھک کر
سوئی ہوئی تھی' شور سنا تو خوف کے مارے
تھر تھر کانپی' روزِ عدالت سے گھبرائی
روپ بدل کر پیچھے نکلی' آگے آگے
مشرق کے پنڈت' مغرب کے گرجا والے
(نظم: فرار شکست انتقام وغیرہ وغیرہ)

اچھا ہوا کہ رسمِ مروت بھی اٹھ گئی
اچھا ہوا کہ آنکھ کا پانی بھی ڈھل گیا

○

مرتے ہو دوسروں کو تو جانیں عزیز ہیں
آشفتہ حالو' خفتہ سرو' خوش رہا کرو

ان اشعار میں ایک حقیقت کی دو مختلف صورتوں کے تضاد سے زندگی کا جو پہلو سامنے آتا ہے وہ کبھی تلخی کا روپ دھارتا ہے اور کبھی محض ایک بالغ معروضی بصیرت کا پتا دیتا ہے۔ سجاد باقر رضوی کے الفاظ میں "سوچ مری صدف صدف" کی بیشتر نظمیں اسی معروضیت کا پیش خیمہ ہیں جو اعلیٰ سطح کی معروضی شاعری کا پتا دیتی ہیں۔ اب خطابتی رومانیت کی پہلے سے متعین شدہ اقدار مصطفےٰ زیدی کی شاعری میں نہیں ملتیں' جب شاعر چند اقدار پر ایمان رکھتے ہوئے انھیں مروج کرنے کی کوشش کرتا ہے تو خطابت کی شاعری پیدا ہوتی ہے اور جب وہ حقیقت کے بارے میں محض اپنی بصیرت کا اظہار کرتا ہے تو شاعری کی سطح مختلف ہو جاتی ہے۔ ولیم شیکسپیر کے مشہور ڈرامائی کردار پولو نیئس پر جو نظم اس مجموعے میں شامل ہے' اسی ذیل میں آتی ہے(۲)۔ جبکہ اس نوع کی معروضیت کی بہترین مثال نظم "گواہی" ہے:

خدا کی قسم
جو کہوں گا فقط سچ کہوں گا
کٹہرے کے پیچھے یہ انسان دراصل ایک بھیڑیا ہے
بہت ہم نے اسے سمجھایا حقیقت کا رستہ دکھایا
ہر اک رنگ سے راستی پر بلایا
مگر یہ نہ آیا
یہاں تک کہ روز جب رات دن سے گلے مل رہی تھی
(ہوا چل رہی تھی' کلی کھل رہی تھی)
میں اک چیخ سن کر کنوئیں پر جو پہنچا تو دیکھا
کہ یہ بھیڑیا ایک کم سن کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کی آبرو کا لہو کر رہا ہے

خدا کی قسم۔
جو کہوں گا فقط سچ کہوں گا
کٹہرے کے پیچھے یہ انساں دراصل اک دیوتا ہے
جو نیلی گپھاؤں سے' اودے افق سے ہمارے لئے رہنما بن کے آیا

ہمیں اس نے چلنا' ابھرنا' بھٹک کر سنبھلنا سکھایا
مگر اس کے ہمسائے کی آمرانہ رعونت کو یہ سب نہ بھایا
اور اک شام جب یہ مرے ساتھ اک کھیت میں چل رہا تھا
یہ ہمسایہ اپنے کئی نوکروں اور غلاموں کو ہمراہ لایا
زدو کوب کی' ایک جھوٹا مقدمہ بنایا
قیامت تو یہ ہے کہ ے ایک نے پی ہے اور دوسرا ہاؤ ہو کر رہا ہے!

(نظم: گواہی)

مصطفےٰ زیدی کے اس مجموعے میں تیغ الہ آبادی کا رنگ خصوصاً" نظموں میں' جھلک دکھاتا ہے۔ ایک علامت "" منزلیں"" فاصلے" 'وفا کیسی" جدائی" چیئرنگ کراس" اور "سینی ٹوریم" اس کی مثال ہیں۔ "نظم وفا کیسی" میں وہ تصویر جلتی ہوئی دکھائی گئی ہے جسے شاعر نے ایک مدت تک سینے سے لگائے رکھا اور "چیئرنگ کراس" میں اس کے بعد کی صورت احوال ہے:

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی
جس سے بے نور خیالوں پہ چمک آتی تھی
اور اب یاد کے اس آخری پیکر کا طلسم
قصۂ رفتہ بنا' زیست کی باتوں سے ہوا
دور اک کھیت پہ بادل کا ذرا سا ٹکڑا
دھوپ کا ڈھیر ہوا' دھوپ کی باتوں سے ہوا
اس کا پیار' اس کا بدن' اس کا مہکتا ہوا روپ
آگ کی نذر ہوا' اور انہی باتوں سے ہوا

(نظم: وفا کیسی)

☆

کوئی تم سے پوچھے
ستاروں کی رونق' چراغوں کی قربت' شبستاں کے اسرار کافی نہیں تھے

جو تم نے کسی طاقِ دل سے لرزتی ہوئی موم بتی کی لو بھی چرا لی؟ _
کوئی ہم کو دیکھے
سرِ رہ گزر ایسے بیٹھے ہیں جیسے
کسی نے ذرا بھی جو پوچھا تو اس سے بگڑ کر کہیں گے
یہ دیر و حرم تو نہیں کعبہ و آستاں تو نہیں ہے
خدا کی زمیں ہے' رہ عام ہے' کوچۂ یار نامہرباں تو نہیں ہے

(نظم چیرنگ کراس)

کتاب کے پہلے حصے کے خاتمے پر نظم "دوری" ایک مدھم لے کی طرح دل میں اتر جاتی ہے اور یہ شیخ الہ آبادی کا آخری نقش ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان ہے "ڈھونڈ چکا میں موج موج' دیکھ چکا صدف صدف" یہ سفر یورپ کی روداد ہے اور بلاشبہ اردو شاعری میں ایک نرول تجربہ بھی۔

آگ کے دشت پڑے' خون کے صحرا آئے
اب بھی لیکن وہی رفتارِ جواں ہے کہ جو تھی
میونخ اب بھی ہے ہر اک عہد کا روشن وارث
ہائڈلبرگ وہ حکمت کی دکاں ہے کہ جو تھی
قرض کرتے ہیں تری مرگ وہی لوگ جنہیں
خود نہ جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا شعور

(جرمنی)

اک عمر تو گزری ہے بہ سرِ خنکیِ محراب
اک شام گناہوں کی حرارت میں بھی گزرے
اے میرے بدن تیری عبادت میں بھی گزرے

(فرانس)

نگر نگر کے خواب میں گم ہیں ڈوور کے ملاح
میں ان خوابوں کے پیہم سناٹے سے آگاہ
اونچی لہریں' بہتا دریا' نیچی شہر پناہ

شاید اس طوفان میں ساری بنیادیں ہل جائیں
آؤٹ ویڈرز ہن، فرالائن، آؤٹ ویڈرز ہن—(۳)

(ڈوور)

"موج مری صدف صدف" میں شامل نظم "پولونیس" ولیم شیکسپیر کے ڈراما "ہملٹ" کے ولن کی بڑی جامع، بلیغ اور ہمدردانہ تصویر ہے اور "اپسراؤں کا گیت" ایک ریوو ہے۔ جسے لندن کے قدیم ونڈمل تھیٹر کے ایک طربیے کا تاثر کہنا چاہیے۔

مجموعہ "گریبان" پہلی بار ۱۹۶۳ء میں مکتبہ ادب جدید، چوک مال روڈ۔ لاہور نے شائع کیا۔ ناشر امان عاصم اور سرورق اینا مولکا کا بنایا ہوا۔

ابتداء LOUIS MAC NEICE کی ایک نظم سے ہوتی ہے۔

VOLYPTUARY IN HIS TEENS AND CYNIC IN HIS TWENTIES, HE RAN THROUGH
WOMEN LIKE A CHILD THROUGH GROANING HAY,
LOOKING FOR A LOST TOY, WHOSE CAPTURE MIGHT ATONE,
FOR HIS OWN GUILT AND THE COSMIC DISARRAY.

بے شک مجموعہ "گریبان" مصطفےٰ زیدی کی شاعری کے نئے موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ "شہر آذر" کے بعد اندر کے شاعر کو مجبوراً" سی ایس پی مصطفےٰ زیدی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس دوران کہیں کہیں افسر اور شاعر کے درمیان زوروں کا رن پڑا۔

جس دن سے اپنا طرز فقیرانہ چھٹ گیا
شاہی تو مل گئی دل شاہانہ چھٹ گیا

☆

کس طرح اپنے سائے کو خود سے جدا کروں
کیوں اپنی طبع شاعر خود دار چھوڑ دوں

☆

چھوڑو میاں یہ مشغلۂ شعر و شاعری

آؤ شکار کے لئے کہسار کو چلیں

☆

اک مہ جبیں کے واسطے رونے سے فائدہ
تسکینِ قلب کے لئے بازار کو چلیں

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یک بیک مصطفےٰ زیدی نے اندر کے شاعر کو آزاد کر دیا۔ اس طرح دونوں میں مفاہمت کی ایک نئی صورت پیدا ہوئی۔ معاشرتی شخصیت نے شعری شخصیت کے ساتھ ایک نیا توازن قائم کر لیا۔

دستار کیسے پھینک دوں ٹھوکر کے واسطے
میخانہ کیسے چھوڑ دوں دفتر کے واسطے

انا پسندی اور میخانے کی یہ جیت دراصل شعری شخصیت کا اعتراف ہے' جس کی عطا "گریبان" کی شاعری ہے۔ "گریبان" مصطفےٰ زیدی کے نظریۂ فن اور شعورِ زندگی کا آئینہ ہے'جس میں فرد اور سماج کے مختلف متحارب تصویریں ملتی ہیں اور زندگی کے ارتقاء کے نئے مفاہیم ہیں۔ حقیقتیں بے حجاب بلکہ برہنہ' کبھی میٹھی اور اکثر اوقات سخت کڑوی۔

"گریبان" میں بظاہر اداسی اور مایوسی کے بادل چھائے ہوئے ہیں لیکن اس کی تہہ میں ایک نئی زندگی کلبلاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے:

ایسی سونی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی
دل بجھے جاتے ہیں اے تیرگیِ صبحِ وطن

گو یہاں تک مصطفےٰ زیدی کی شاعری آلودگی اور لذتیت سے خالی نہیں لیکن وہ اس کا شکار ہو کر نہیں رہ گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے محبت میں سب کچھ جائز سمجھا اور ہر "ناجائز" کو کھلے بندوں کرنا بھی چاہا۔ لیکن اس کے لئے بھی تو ایک خاص قسم کے شاعرانہ حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

افسانہ در افسانہ تھی مرتی ہوئی سیڑھی
اشعار در اشعار تھا ہر در اُسی گھر میں

اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں بھبھوت ملے سادھو' دھانی دوپٹے اور پنگھٹ سے پلٹتی لڑکیاں 'ہندوستانی لوک گیتوں کا پس منظر لئے' جگہ جگہ اپنی جھلک دکھاتے ہیں جس کی ایک خوبصورت مثال نظم "کہانی" ہے۔ یوں "گریباں" میں مصطفٰے زیدی کی شاعری اپنی تصویر کاری کے حوالے سے ایک جست لگا کر مخصوص منفرد رنگ میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔

نئے پھول مالی سے منگوائے تھے' بام و در پہ نیا رنگ وروغن کیا تھا
کتابیں سلیقے سے رکھ دی تھیں بوتل ہٹا دی تھی' گھر میں چراغاں کیا تھا

(چراغاں)

"گریباں" کی ایک خصوصیت شاعر کے لہجے کی کھنک اور زبان کے استعمال پر ماہرانہ دسترس بھی ہے۔

ہائے تو راکھ کی مانند بجھا بیٹھا ہے
شعلہ رخ' شعلہ صفت' شعلہ بداماں زیدی
وہ مجسم کوئی آیت کوئی نور افلاک
میں پراگندہ' نہ ملحد نہ مسلماں زیدی

اور پھر محبت اور نفرت کی نئی تعبیریں:

مت پوچھ کہ ہم ضبط کی کس راہ سے گزرے
یہ دیکھ کہ تجھ پر کوئی الزام نہ آیا

☆

جب ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی
مدتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی

"گریباں" میں لوئی میک نیس کی دو نظموں "نہ کوئی مخلی تصویر نہ کوئی نغمہ" اور "پیدائش سے پہلے" کے عنوانات کے ساتھ تراجم بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ جسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا معنوی اعتبار سے اپنے داخلی ربط کے تحت مربوط ہو کر ایک اکائی کی طاقت بھی رکھتا ہے۔

چھٹا مجموعہ کلام "قبائے ساز" پہلی بار ۱۹۹۷ء میں جوش اکیڈمی کراچی نے شائع کیا۔ اس مجموعے میں بہت سی نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جو ان کے سابقہ مجموعوں میں چھپ چکی ہیں۔ فیض صاحب کے مجموعوں کی طرح "قبائے ساز" میں بھی اس مکرر اشاعت کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

وقار عظیم (۳) نے مصطفےٰ زیدی کی شاعری کے لہجے ("قبائے ساز" کے حوالے سے) پر بات کرتے ہوئے اس کی دو واضح سطحیں دریافت کی ہیں۔ جن میں سے ایک ناصحانہ 'خطیبانہ' اور تحکمانہ زور اور جوش ہے اور دوسرا عاجزانہ' مشفقانہ اور رازدارانہ ملائمت اور نرمی۔ یہ اس کی ذات یا "میں" کے دو حصے ہیں اور اس "میں" کو تکمیل کی جس منزل تک پہنچنے کے لئے مختلف مراحل طے کرنا ہیں' شاعر بار ہا وہاں تک پہنچتا ہے اور یوں فکر و خیال اور ذکر و بیان سب میں صحیح قسم کا آہنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور رچاؤ بھی۔ لیکن بقول وقار عظیم "قبائے ساز" اس سفر کے درمیان کی کسی منزل کا نام ہے' منزل مقصود نہیں۔ تبدیل ہوتے ہوئے لہجوں کی بہترین مثال نظم "زخم سفر" ہے۔

"قبائے ساز" میں موضوعات کی "ہمہ سمتی" کو خود شاعر نے نہ جانے کیوں "بے سمتی" کہا ہے؟ جب کہ یہ اسی کی عطا ہے۔

سنبھل سنبھل کے چلے دوستانِ عہد طرب
کوئی قدیم رفاقت گلے نہ پڑ جائے

☆

غرض کسی کو کسی سے کوئی گلہ نہ ہوا
مہاجروں کے محلے میں حادثہ نہ ہوا

☆

ساری محفل لطفِ بیاں پر جھوم رہی ہے
دل میں ہے جو شہرِ خموشاں کس سے کہیے

☆

شہر در شہر پھری میرے گناہوں کی بیاض
بعض نظموں پہ مرا سوزِ حکیمانہ کھلا

☆

وہ اک طلسم تھا قربت میں اس کے عمر کٹی
گلے لگا کے اسے اس کی آرزو کرتے

"کوہِ ندا" آخری مجموعہ کلام۔ پہلی بار ۱۹۷۱ء میں کتب پرنٹرو پبلشرز لمیٹڈ بندر روڈ کراچی نے شائع کیا۔ کتاب کا سرورق خود مصطفےٰ زیدی نے بنایا تھا۔ کتاب میں دیباچے کے ساتھ مصطفےٰ زیدی کا ایک مختصر مضمون اُس کی اپنی شاعری کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن "ماورا" کالج روڈ۔ راولپنڈی نے ستمبر ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔

مصطفےٰ زیدی کا یہ آخری مجموعہ انبوہ کی تنہائی کا المیہ سامنے لاتا ہے۔ اس میں سب سے واضح تصویر دوست نما دشمنوں اور تنہائی میں رسوائے زمانہ مصطفےٰ زیدی' سی ایس پی کی ہیں جو شاعر بھی ہے۔ اس مجموعے کی اکثر نظموں میں شاعر اجنبی خوف کو سینے میں چھپائے خود کو سائے کی طرح چلتا ہوا دیکھتا ہے۔

ذات کے کرب میں بازار کی رسوائی میں
تم بھی شامل ہوا س انبوہ کی تنہائی میں

○

جدھر جدھر سے بھی گزرا جلوسِ رسوائی
کھڑے تھے لوگ دریچوں میں شمعِ داں کی طرح
بوقتِ قتل بہت دور میرے سارے عزیز
صف آزما تھے نگہبان آسماں کی طرح

خوف و ہراس اور دشمن شہر میں حساس شاعر کی بے نوائی کی تصویر کشی اس سے بہتر کیا ہو سکتی تھی؟ اور پھر ایسے میں دشمن معاشرے سے خدا کی طرف رجوع' ایک فطری

رویہ ہے۔

اپنے مذہب کی طرف اپنے خدا کی جانب
ایہاالناس چلو کوہ ندا کی جانب

موضوعات کے اعتبار سے "کوہ ندا" پر ابتدائی تین مجموعوں کا سایہ چھتا ہوا سا یہ ہے البتہ "گریبان" موج میری صدف صدف" اور قبائے ساز" کہیں کہیں ضرور اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔

"موج میری صدف صدف" کا سیاح "کوہ ندا" میں بھی اپنے سفر کی رُوداد بیان کرتا ہے لیکن اب سفر کا استعارہ کہیں زیادہ معنی خیز ہے۔ قدم قدم پر نئے جہان ہیں۔ عظیم شہر' ماضی کے غیر اہم مقامات۔ جہاں تاریخ ساز سیاسی جدو جہد جاری ہے اور پرانی تہذیبوں کے کھنڈر۔ راستے کی صعوبتیں اور ان جانے دریاؤں کے راز سب آشکار ہوتے ہیں۔ "کوہ ندا" کا مسافر اپنے وطن کے لئے بیافرا کے شہیدوں کے لہو کے داغ اور ویت نام کی مٹی سے اٹی پھٹی ہوئی قمیض کا تحفہ لایا ہے۔

قبول کر میری میلی قمیض کا تحفہ'
کہ اس کی خاک میں سجدوں کی سرزمینیں ہیں
نہ دُھل سکے گا یہ دامن کہ اس کے سینے پر
بیافرا کے مقدس لہو کی چھینٹیں ہیں

اجنبی دیاروں کے مسکراتے اور تیوری چڑھے چہرے بہت سی خوشیاں اور بہت سے غم دے گئے تھے۔ وہ ضمیر کا لہجہ اور اصول کی بات ہر جگہ ڈھونڈتا پھرا لیکن تعقل پسندی کی یورش نے قدیم اعلیٰ اقدار کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ بقول جیلانی کامران' اس مجموعے کی کلیدی نظموں "میری پتھر آنکھیں" "' مسافر" ویت نام" "کوہ ندا اور "سپردگی کا یہ عالم" میں بدن کو سچائی سمجھنے کی نفی کی گئی ہے۔ اور بدن کے حوالے سے ہر اس بات کی نفی کی گئی ہے جو ظاہر محض ہے اور جس کا کام انسان کو اپنے طلسم میں قید کرنا ہے۔ اگر سوچ کا انداز ایسا نہ ہوتا تو " پتھر آنکھیں" کے تجربے میں "کوہ ندا" کا مضمون شامل نہ ہوتا۔ نظموں کے فکری ماحول میں "کوہ ندا" کو حاتم طائی کے سفرناموں سے مستعار لے کر لوک کہانیوں کے اس پہاڑ میں بدل دیا گیا ہے۔ جہاں

گانے والا پرندہ ہے اور بکاولی کا پھول۔

"کوہ ندا" میں پانچ نظمیں شہناز گل کے نام ہیں۔ ان نظموں میں توقع کے سرا سر بر خلاف جذباتیت سے دور رہ کر ایک خاص قسم کے ٹھہراؤ کی کیفیت ہے' بلکہ سانس تک ہموار رکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ "کوہ ندا" کے آخر میں ضمیمے کے طور پر ایک غزل اور تین نظمیں شامل ہیں' جنہیں خود شاعر نے مجموعے میں شامل کرنا نہیں چاہا۔ انہی میں سے ایک نظم "در ہجو آشوب تقرر" کو اصل نسخے میں "ذاتی نظم" لکھا گیا ہے۔ یہ نظم جہلم سے لاہور تک کی داستان ہے۔ باقی دونوں نظمیں خاصی مشہور ہیں۔ "ریستوران میں" ہائینے کی انگریزی نظم کا ترجمہ ہے اور "اے کربلا" ایک مرثیہ۔ جب کہ غزل کے چاروں اشعار طنزیہ ہیں۔

مصطفیٰ زیدی کے ساتوں شعری مجموعوں پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اس کے کلام کا تفصیلی مطالعہ ہم تین سطحوں پر کرسکتے ہیں۔ پہلی سطح شعریت سے متعلق ہے۔ وہ فارم کے سلسلے میں کسی انقلابی تبدیلی کا تمنائی نہیں بلکہ ایک حد تک روایت کا حامی ہے اور معمولی تصرفات کو ہی جائز قرار دیتا ہے۔ دوسری سطح مواد اور موضوعات سے متعلق ہے۔ اس کے ہاں ہر دور کے بدلتے ہوئے فکری زاویے نمایاں جگہ پاتے ہیں' نیز تغیرات پر اس کی نظر گہری ہے۔ تیسری سطح پر وہ دل آویز شعری تصویر کاری پر قادر ہے ۔ یہ واضح کرتا چلوں کہ اس کی نظمیں مثلاً "نوروز" "نئی آبادی" اور "ویت نام" "نعرہ' آندھی یا بجلی طرح کی چیزیں نہیں' خود اس کے مطابق ذوق نغمہ کے پیچھے "نوا را تلخ تر می زن" کا آہنگ البتہ کہیں کہیں ضرور موجود ہے۔ اس ضمن میں مصطفیٰ زیدی کا کہنا ہے کہ انحطاط کی مجموعی قوتوں سے لڑنے کے لئے فرد کے رومانی تصور کی نہیں بلکہ سماج کی انقلابی تنظیم کی ضرورت ہے۔ جب مرد اپنی اکائی میں ان قوتوں سے لڑتا ہے تو شعر میں اس کا نتیجہ تلخ نوائی ہوتا ہے۔ جب فرد اپنی سماجی حیثیت میں ان سے لڑتا ہے تو کلام میں تلخی کا امکان تو ہے' ہزیان کا نہیں۔"

(دیباچہ شہر آذر)

مجید امجد نے مصطفیٰ زیدی کی نظموں پر بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ مصطفیٰ زیدی تلخ بات بھی شعری لہجے میں کرتا ہے(۵) مجید امجد کے نزدیک یہ اس کے لہجے کی خوبی

رہی ہو گی' لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کے ہاں اوزان پر خصوصی توجہ اور تنوع کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ جو اس کے جذبے کے اتار چڑھاؤ کی غماز ہے۔ اس طور اس کے لہجے بھی مختلف ہیں۔ اس کا لہجہ تلخ بھی ہے اور شیریں بھی اور خصوصی طور پر اس کی طنزیہ حس کافی بیدار ہے۔ سوائے محض شیریں لہجے کا شاعر کہہ کر ہم اس کی اہمیت کم نہیں کریں گے۔

قحط افسانہ نہیں اور یہ بے ابر فلک
آج اس دیس' کل اس دیس کا وارث ہو گا
ہم سے ترکے میں ملیں گے اسے بیمار درخت
تیز کرنوں کی تمازت سے چٹخے ہوئے ہونٹ
دھوپ کا حرف جنوں لُو کا وصیت نامہ
اور مرے شہرِ طلسمات کی بے در آنکھیں
مری بے در 'مری بنجر' مری پتھر آنکھیں
(کوہ ندا)

رابرٹ فراسٹ نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا "میرا اور دنیا کا جھگڑا دو پریمیوں کا جھگڑا ہے" فنکار زندگی سے محبت کرتا ہے اور کبھی زندگی کے بلند تصور کی خاطر اس کے سستے کاروباری تصور سے لڑتا ہے۔ مصطفےٰ زیدی کو بھی زندگی سے محبت ہے۔ وہ زندگی سے لڑتا بھی ہے' اس کے باوجود وہ وقتی موضوعات سے گریز کر کے عالمی اور آفاقی سچائیوں کو شعر کا موضوع بنانے کا جتن کرتا ہے۔

اس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے
رقص تھم جائے اداؤں کے خزانے لٹ جائیں
وقت کا درد' نگاہوں کی تھکن' ذہن کا بوجھ
نغمہ و ساغر و الہام کا رتبہ پا لے
کونپلیں دھوپ سے اک قطرۂ شبنم مانگیں
سنگساری کا سزا وار ہو بلور کا جسم
دل کے اجڑے ہوئے مندر میں وفا کی مشعل

مصلحت کشتی طوفان کی زد میں آجائے
آہوئے دشت جنوں شہر کی حد میں آجائے
سب کے قدموں میں تمنا ہے خمیازہ گرے
عاقلو! دیدہ ورو! دوسری راہیں ڈھونڈو
اس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے
(نظم: فرار)

مصطفےٰ زیدی کی شاعری کی ایک نمایاں صفت "خلوص" ہے اور بقول چینی فلسفی لن یو تانگ کے، جو چیز ادب کو پروپیگنڈا سے ممتاز رکھتی ہے وہ فنکار کا خلوص ہی ہے۔ یوں پرخلوص جذبوں کی شرکت کے سبب مصطفےٰ زیدی کے ہاں ہنگامی موضاعات بھی اکثر اوقات ادب عالیہ میں جگہ پاتے ہیں۔

اس کی شاعری خط مستقیم کی شاعری نہیں۔ اس لئے ہم اس کے فکری رخ انداز نگارش کا احاطہ آسانی سے نہیں کر سکتے۔ وہ ہر طرح کے موضوعات چنتے ہوئے لہجے کا تنوع سامنے لاتا ہے اور اس کے پیچھے انگریزی، اردو اور فارسی ادبیات کی مضبوط سپلائی لائن موجود ہے۔

اس کے ہاں اک عجب مقناطیسی آنکھ کا کرشمہ توجہ طلب ہے۔ اس آنکھ پر معاشرے کا تار و پود اپنے ایک ایک ریشے کا احوال کھولتا ہے۔ ایزرا پاؤنڈ نے ادب کو معاشرے کا مقیاس الحرارت ہی تو کہا تھا۔ مصطفےٰ زیدی کی "نوروز" "دسہرہ" "اقوام متحدہ" "میں امن چاہتا ہوں"، "کالج نوٹ بک میں"، "کراہتے ہوئے دل" "گرب اسٹریٹ کی کہانی" اور "موج مری صدف صدف"، اسی مقیاس الحرارت کے مختلف درجے ہیں۔

دوسری طرف جیلانی کامران کے نزدیک زیدی کے ہاں بین الاقوامی منظرنامہ ایک پیمانہ ہے، جس کے ذریعے شاعر ایک طرف اپنے آپ کو اور دوسری طرف اپنے ملک کی قدروقیمت کی پیمائش کرتا ہے اور ان نظموں میں ندامت کا پسینہ ایک ایسا اشارہ ہے جس کی مدد سے شاعر اپنے ملک کو اپنی کم مائگی کا تحفہ دیتا ہے۔ لیکن اس کم مائگی میں ایک طرف نہ ہونے اور نہ کرنے کا دکھ ہے اور دوسری طرف خواب اور خواب کی فصلیں شامل ہیں۔ شاعر خواب اور موت نما حقیقت کے درمیان راستہ تلاش کرتا

دکھائی دیتا ہے۔ " زنجیریں " سے " موج مری صدف صدف "تک کے مطالعہ سے یہ شائبہ یقین میں ڈھلنے لگتا ہے کہ شاعر محض دروں بینی پر اکتفا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن "موج میری صدف صدف" کے بعد "قبائے ساز" اور کوبندا" میں اس کی یہی دروں بینی معاشرتی اور عصری احساسات سے گھل مل کر ایک نئی شکل اختیار کرتی ہے۔

مصطفےٰ زیدی کے ہاں ان تمام کرداروں کی چلتی پھرتی پرچھائیاں نظر آتی ہیں جو ہمارے تاریخی اور سماجی اسٹیج پر گردش کرتے آئے ہیں۔ ہمارے شاعر کے نزدیک زبان ایک زندہ قوت ہے۔ جس کی روح بہر طور جیتا جاگتا معاشرہ ہی ہے اور جس کی اپنی روایات 'تاریخ اور اساطیر ہیں' اور جو ہمارے انفرادی شعور کے ساتھ اجتماعی شعور کا بھی حصہ ہے۔ اک تاریخ ہے اجڑی ہوئی محرابوں میں۔

تمدن کے کھو جانے کا قصہ 'ساری عمر خون رلانے والی ہجرتیں' وہ بستیاں' وہ چھوڑے ہوئے گھر' کبھی ساتھ نہیں چھوڑتے۔ وہ موسم جو بیت گئے اور کبھی لوٹ کر نہیں آئے' یہ سب ہمارے شاعر کی مضبوط سیاسی لائن ہے۔

کونپلیں کیسی ہیں' شیشوں کے مکاں کیسے ہیں

○

تم نے نفیری اور کہیں پہ سنی ہوگی
اس نگری میں یا سناٹا یا کہرام
شہر وفا کو جائیں اے دل زار
سب مر جائیں رگھو پتی رگھو راجارام
(نظم: کربلا)

مصطفےٰ زیدی کے ہاں کلاسیکی شاعری کا ایک ایسا رچاؤ ہے جس پر انگریزی ادبیات کے ایک خوشگوار اثر اور جدید انسان کے ذہنی جوار بھاٹے کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ مغربی شعراء میں سے ایلیٹ اور لوئی میک نیس کو تو وہ مانتا ہی تھا لیکن چند دیگر شعراء کی گونج بھی اس کے ہاں سنائی دیتی ہے اور وہ ہیں آڈن ولیم کارلوس' ہاپکنز اور سپنڈر۔ اس کی شاعری DIRECT کم اور OBLIQUE زیادہ ہے اس لئے کہ وہ رمز کا شاعر ہے۔ لیکن اس کا ذہن اتنا مرتب اور فنی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ وہ جو کہنا چاہتا

ہے اس کے صحیح خدوخال کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

کوئی ستفسد جنوں' کوئی ساعت مرہم
روا نہ" کبھی دیکھے ہماری سمت کہ ہم
ہزار مصلحتوں کو شمار کرتے ہیں
تب ایک زخم جگر اختیار کرتے ہیں

اس کے ہاں فراق اور وصال کے بیان میں اس کا خالصتاً" نجی تجربہ بولتا ہے۔ شاید اسی لئے اس کا محبوب اردو غزل کے روایتی محبوب سے مختلف ہے۔ "ایک بات اپنی غزل کے محبوب کے بارے میں کہتا چلوں کہ اس کا پیکر شعری ورثے میں مجھے نہیں ملا' یہ پٹرول 'ٹینک' کروزی' تھرماس' ائیرپورٹ 'ریوالان' کسن' اور تعلقات عامہ کے زمانے کا محبوب مخمل لباس پہنتا ہے نہ ہزار چلمنوں میں رہتا ہے۔" (شام غزل ——کوہ ندا)

اس کا رونا ہے کہ پیاں شکنی کے باوصف
وہ ستم گر اسی پیشانی' خنداں سے ملا

اس کی تمام تر شاعری میں حسن غیر منفعل اور جامد ہے' اور عشق ایک فعال قوت۔ ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو اس کے محبوب کے تین رخ بہت واضح نظر آتے ہیں۔ ایک تو مشرقی نسوانیت کا ہی ہے۔ جبکہ دوسرا رخ سوسائٹی گرل کا' ڈاسن کارٹر نے اسکی مکمل شکل کو "وکٹری گرل" کہا ہے وکٹری گرل زمانے کی وہ "تاہی منڈا" لڑکی بھی ہے جو خود مختار ہے اور مردوں سے ناجائز جنسی تعلقات استوار کرتی ہے۔ روس میں "WABCI" اسی قسم کا کردار تھا جو گزشتہ جنگ عظیم کے دوران ابھرا۔

مصطفے زیدی کا اپنے محبوب کو " معاشیات کا سوال' کہنا اس عہد کا المیہ ہے کہ انسانی تعلقات پر سے اعتماد اٹھتا جاتا ہے اور بعض اوقات تو بیوی بچے بھی محض اقتصادی رشتے سے منسلک معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں کارل مارکس کا قول یاد آتا ہے کہ تمام انسانی ادارے اور تمام رشتے ناطے' معاشرے کی اقتصادی ساخت سے ترتیب پاتے ہیں۔

اے تم لوگ کیا سمجھو گے جیسا ہم سمجھے ہیں

مگر پیار بھی کریں گے اس سے پیاں دیکھتے رہنا

محبت کے سلسلے میں وہ گرمیٔ پیمان وفا کو محبوب کے زینتِ آغوش بن جانے پر ترجیح دیتا ہے۔

کاش وہ زینتِ آغوش کسی کی بن جائے
اور مجھے گرمیٔ پیمان وفا مل جائے

یہ عورت کی بیسوائی' اعتماد کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ شاید اسی لئے فراق کے لمحوں میں وہ دہری پریشانی میں مبتلا نظر آتا ہے۔

میں ہسپتال کے بستر میں تم سے اتنی دور
یہ سوچتا ہوں کہ ایسی عجیب دنیا میں
نہ جانے آج کے دن کیا نہیں ہوا ہوگا
کسی نے بڑھ کر ستارے قفس کئے ہونگے
کسی کے ہاتھ میں مہتاب آگیا ہوگا

ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اس کی نظر میں مرد اور عورت کے آزاد جنسی اختلاط سے بڑھ کر کوئی رشتہ اہم نہیں رہ جاتا۔

زندگی جسم کی خواہش کے سوا کچھ بھی نہیں
خون میں خون کی گردش کے سوا کچھ بھی نہیں

ماضی اور حال میں یوں تو محبت کی کامیابی ایک ہی سائنٹیفک نظریہ سے وجود میں آئی ہے کہ ہر دو ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن قدیم کہانیوں میں شہزادی کا عاشق کبھی فقیر بھی ہوا کرتا تھا۔ کیا آج یہ محض کہانیاں ہی نہیں؟ ان بنتے اور ٹوٹتے رشتوں ناتوں سے حاصل کی ہوئی بصیرت کو مصطفےٰ زیدی نے ایک شعری نام دیا ہے "INTENSITY"۔

دل میں چھائی جا رہی ہیں اس کی آنکھیں اس کے بال
جانے کیا ہوگا اگر ایسے خیال آتے رہے

اسی شدتِ احساس کے باعث اس کے ہاں ایک چہرا اپنے ساتھ تمام تمنی خوبصورتیاں لے بار بار ابھرتا ہے۔

اور جو تصور میں آنسوؤں کی چلمن میں
اس طرح ابھرتا ہے جیسے گھر سے پہلی بار
اک شریف کنبے کی نازنیں نکلتی ہے

اس محبت کی عجیب خصلت ہے کہ اس کو نہ محبوب کے بارے میں کوئی واہمہ ہے اور نہ اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی۔

انھی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

یہاں W.B. YEATS کی یاد آتی ہے۔ جس نے اپنی محبوبہ کی بے مہری کا گلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "محبت تو میں اور بھی کرلوں گا لیکن یہ روز مرہ کی زندگی میں جو ایک دوسرے کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مہربانیاں ہیں یہ اور کہاں ملیں گی۔ مصطفےٰ زیدی نے یہ بات بار بار دہرائی ہے دوسری طرف اس کے ہاں "دانۂ گندم" "چاک پیراہن دل" "لہو کی زحمت اقدام" وغیرہ ایسے تلازمے ملتے ہیں جن سے اس کے فلسفہ معصیت کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے۔

تری ہنسی سے تو میری شکست ہی بہتر
مری شکست میں تھوڑا سا اعتماد تو ہے

وہ ماضی میں گناہ نہ کرسکنے پر پچھتاتا نہیں' اس لئے کہ وہ زندگی کو لمس طویل میں گزارنا نہیں چاہتا' البتہ ایسا انحصار' جس سے فرائیڈ کے نزدیک فن کی نفسیاتی الجھنوں کو ارتفاع حاصل ہوتا ہے۔

حصول تسکین کے ثانوی ذرائع دو طرح کے ہیں کچھ تو فرد اور سماج دونوں کے لئے مضر رساں اور کچھ بالکل بے ضرر۔ فنی تخلیق ایسی چیز ہے' جس کے ذریعے محرومیوں کی تلافی بھی ہو جاتی ہے اور بقول محمد حسن عسکری' پڑوسیوں کی نیند میں خلل بھی نہیں پڑتا' آئی اے رچرڈز کی کتاب "سائنس اور شاعری" کے رد عمل کے طور پر ٹی ایس ایلیٹ نے اپنے لیکچرز میں انسان جدید کے پانچ اہم مسائل کا جائزہ لیا تھا۔ احساس تنہائی' پیدائش اور موت کا مسئلہ ------- وقت کے تناظر میں انسان اور کم علم انسان۔ جب کہ احساس تنہائی کو سب سے زیادہ اہمیت ملی اور یہ انیسویں اور

بیسویں صدی کا یکساں اہم موضوع مانا گیا ہے۔ شیلے اور بائرن محض آزادی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ لیکن جب اس مقصد کے حصول میں ناکام ہوتے ہیں تو بے زاری کے ساتھ تنہائی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔ اردو شاعری میں تصدق حسین خالد کی نظم "کس قدر تنہا ہے تو" اور فیض کی "تنہائی" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس طرح مصطفےٰ زیدی کی نظم "تنہائی" کے علاوہ بکھرے بکھرے بیسیوں اشعار' تنہائی اور اجاڑ پن کے بہترین عکاس ہیں۔ مصطفےٰ زیدی کے ہاں یہ احساس' اجتماعی اور انفرادی آزادی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں سے بھی پیدا ہوا ہے اور اس کی جڑیں مذہبی' جذباتی اور اخلاقی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ میں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں۔ یقیناً ہمیشہ ایسا تنہا آدمی شعر کہتا ہے' جس کے لئے خاموشی ناقابل برداشت بن چکی ہو۔ فنکار خود کو خرچ کرتا اور زندگی کو متمول بناتا ہے اور یہی رویہ عاشق اور جہاد کا ہے۔

"MAN CAN LIVE BY POETRY ALONE"

(CLEANTH BROOKS)

عاشق' شاعر اور مجاہد مسرتوں اور ہنگامہ آرائیوں سے دور رہتے اور تنہائیوں کی رہ اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے شاعر نے بھی یہ راہ چنی تھی اور زندگی کو ایک فراخدل سخی کی طرح دونوں ہاتھوں سے لٹایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر مصطفےٰ زیدی کے ہاں شخصیت کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کی اکثر نظموں اور غزلوں میں مصطفےٰ زیدی خود مرکزی کردار ہے اور واحد متکلم کا صیغہ۔ اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مصطفےٰ زیدی محض اپنے خوابوں کے ساتھ پوری کائنات کو دیکھتا ہے۔

پلکوں پہ آ کے رک سی گئی تھی ہر ایک موج
کل رو لئے تو آنکھ سے دریا اتر گیا

بودلیئر نے کہا تھا کہ کسی کو الزام دینا' کسی کی مخالفت کرنا' بلکہ انصاف کا مطالبہ کرنا بھی بد مزاقی ہے۔ مصطفےٰ زیدی اپنے کسی رخ سے بھی بد ذوق نظر نہیں آتا۔ لیکن اشعار میں وہ الزام بھی دیتا ہے' مخالفت بھی کرتا ہے اور انصاف کا مطالبہ بھی۔ یہ محرومیت زدگی کا رویہ ہے۔

یہ سرج کے سوٹ اور یہ سوچنا کہ گھر میں تو کچھ نہیں ہے

☆

تمہیں یہاں کے اندھیروں کا علم کیا ہوگا
تمہیں تو صرف مقدر سے چاند رات ملی
(نظم "کراہتے ہوئے دل")

مصطفےٰ زیدی چاروں اطراف سے آئے ہوئے جلا وطنی کے حکم ناموں پر زبردستی دستخط کرنے والا شاعر ہے۔ وہ جارج سیفرس کی طرح ایسا جلا وطن ہے جو جلوس رسوائی میں سے گزرتا' عزت آباء کے سبب گڑے قدم اٹھاتا ہے اور ہر طرف سے جرات اور ضمیر کا قحط اسے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے:

اور گلاب کے پھول میرے ساتھ چلے آتے ہیں
ان کی آوازوں کے اتار چڑھاؤ میں
ان کی نالہ و زاری میں کچھ ایسی ہی کیفیت ہے
جیسا کہ ایک منزل پر پہنچ کر
انسان "ماں" کہہ کر پکارتا ہے اور مدد کے لئے آواز دیتا ہے
یا محبت کی سفید کراہیں ہیں

(جارج سیفرس۔ ڈاکٹر مغنی تبسم)

لٹ گئی دولت ایماں و متاع عرفاں
کیسۂ منبر و محراب و کلیسا مدوے
آج اولاد پہ ہے قحط ضمیر و جرات
خون اجداد رسد' عزت آباء مدوے
(مصطفےٰ زیدی)

مصطفےٰ زیدی نے کہا تھا:

"اردو شاعری میں جس چیز کی سب سے زیادہ کمی ہے وہ ہے PRECISION۔ یعنی ایمانداری' جذبے کے لئے الفاظ تلاش کرنا' وہی الفاظ استعمال کرنا جو اس جذبے کی صحیح عکاسی کرتا ہے' نہ کہ آس پاس کے لفظ۔ ہماری شاعری کے الفاظ دیکھو' کیا کیا رنگیلے' رسیلے اور چمکدار ہیں۔ قفس' شعر' ہم' آوارہ' سنگیت' خرمن' شفق' چاند'

ستارہ' پلک ' نوک ' مژہ ' اجنبی ' رات ' سناٹا ' تنہائی وغیرہ آج کل ہم سب بچوں کی طرح ان الفاظ کے گڈے گڑیوں کے بیاہ رچا رہے ہیں' لیکن اس بیاہ کا نتیجہ کچھ برآمد نہیں ہوتا گڈا نامراد اور گڑیا بانجھ مرجاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جب مشاعرے میں میر صاحب یہ شعر پڑھتے ہوں گے:

دو چار زندہ رہ گئے' دو چار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

تو کیا سماں ہوتا ہوگا۔ دلوں سے سناٹا گزر جاتا ہوگا۔ اہل محفل کے علاوہ رفتگاں کی روحیں بھی وجد کرتی ہوں گی اور ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ ہم نے مرنے کی دھمکیاں دے دے کر لوگوں کو بور کر دیا ہے"۔

(ابن انشاء کے نام ایک خط)

اپنی تمام تر رومانیت اور ترقی پسندی کے باوجود مصطفےٰ زیدی کو انتہاپسند شعراء سے ہمیشہ شکایت رہی۔ نئے شاعر کی روایت شکنی 'صاحب نظری کی دلیل بھی ہے۔ جو اسے قدیم سے آج تک روشن دن تک لاتی ہے' لیکن جہاں کہیں یہ روائی عقلیت پسندی کا رویہ صرف اپنے محبوب کی سترپوشی تک محدود ہو کر رہ جائے وہاں مصطفےٰ زیدی جدید شاعر سے اپنی راہ الگ کر لیتا ہے۔ وہ اپنے بعض ہمعصر شعراء کی طرح ہیئت اور اسلوبیاتی کرتوتوں کے ذریعے محض انوکھا پن پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ جدید شعراء کے ہاں سے مثالیں دیکھتے چلیے:

(۱) چھپے ہیں دھوپ کے پنچھی شکاریوں کی طرح (اقبال ساجد)

(۲) " کس قدر شور ہے!
کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے
جانے سب ایک ہی ساتھ کیوں بولتے ہیں
——— کس قدر تھک گیا ہوں
سفر بھی اذیت تھا
اب بے سفر بھی اذیت میں ہوں
میرا!

ایک بوتل بیئر کی

(دائیں جانب سے ★ داخل ہوتا ہے ☆ کو
دیکھ کر جھجکتا ہے۔ شور معدوم ہو جاتا ہے)

(انور معظم)

مصطفےٰ زیدی کی لے اس قدر مانوس بھی نہیں کہ گئے وقتوں کی جگالی لگے، البتہ اس کے لہجے سے گزرے وقتوں کی بیتی ہوئی آوازوں کا سراغ ملتا ہے۔ اس کا شعر اردو شاعری کے مجموعی آہنگ میں مدغم ایک لطیف سُر ہے۔

مصطفےٰ زیدی نے جہاں مروجہ اسالیت سے انحراف کیا ہے، وہاں بھی پڑھنے والوں کی توجہ اس تجربہ، انحراف یا اسلوب پر نہیں ہوتی۔ موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہونے والا جادو ہے جو اپنا کام کرتا رہتا ہے اور قاری غیر محسوس طور پر اس تجربہ یا انحراف کو شاعری کا ناگزیر جزو سمجھ کر قبول کرتا ہے۔

مصطفےٰ زیدی کے ہاں متحرک اور ساکت تمثالیں کثرت سے ہیں جو اس کی طبیعت کے تحرک پر دال ہیں۔ نغمگی اور آہنگ کے تنوع کے ساتھ یہ تمثال کا تنوع اس کی ذات کے شعری امکانات کا غماز بھی ہے۔ وہ ہمیشہ شعر سے ایسے اظہار کا طالب رہا کہ "خیال نہ صرف پڑھنے والے تک پہنچ سکے، بلکہ پڑھنے والا اسے انگلیوں سے چھو کر محسوس کر سکے"۔

صہبائے تند و تیز کی حدت کو کیا خبر
شیشے سے پوچھیے جو مزا ٹوٹنے میں تھا

وہ اظہار کے معاملے میں بے دھڑک تھا۔ اس نے ہر حال میں قاری کو اپنے احساس کا شریک بنانا چاہا، اور اس معاملے میں اس نے براہِ راست بیان اور خطابت تک سے کام لیا ہے۔ اس لئے کہ وہ "جدید" شاعر کے اظہار کی بے چینی، پلاٹیشن اور اکھڑی ہوئی سانسوں کو شاعری نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے کلاسیک سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔

سب سنگ بہ جیب تھے سری نہ تھا زخموں کا کوئی خوگر ہی نہ تھا
ہر شخص میں تھی دربان طلبی کیا کج کلہی کیا کم لقبی

ہم بات کریں تو کس سے کریں' بنیاد رکھیں تو کس پہ رکھیں
اے اہلِ ہنر کے عجز سخن ہائے زندگیوں کی بے سببی

انسان کے پاس خدا کا سب سے خطرناک علیہ "زبان" ہی ہے۔ لیکن بڑا شاعر اس علیہ' خداوندی کی تربیت کرتا ہے مصطفےٰ زیدی نے بھی اس کی خواہش کی اور اگر یہ ممکن ہوتا کہ اس کے شعر میں اس کی علمیت اور بڑے ذہن کی کار فرمائی کا اپنی مکمل صورت میں عمل دخل ہوتا تو شاید وہ کہیں زیادہ اہمیت کا شاعر ہوتا۔ البتہ زبان کی طرف خصوصی توجہ کا فائدہ ضرور ہوا کہ لفظ کی صحیح نشست و برخاست پر جو ملکہ اسے حاصل تھا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں اکثر پتھر الفاظ بھی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اٹھتے ہیں۔

اس کے کلام کی حسی شائستگی اسے فراق اور فیض کے دھیمے لہجے کی طرف لے جاتی ہے۔ خصوصاً" اس کے لہجے کی بلند آہنگی اور خطابت رفتہ رفتہ کم ہوئی اور "کوہ ندا" تک آتے آتے نرم لطیف داخلیت میں ڈھلی۔

نئی نئی تھی فلک نا آشناس تھا جب ہم
تری گلی سے نکل کر سوئے زمانہ چلے
نظر جھکا کے باندازِ مجرمانہ چلے
(قبائے ساز)

صنم کدوں میں چراغاں ہے' ہے کدوں کی طرف
نگاہِ پیر مغاں کی سبیل جاری ہے
ہر اک فسوں ہے مگر بے اثر ہے چارہ گرو
(کوہ ندا)

بے شک' بڑی شاعری ضرب المثل بن کر ابھرتی ہے' سو اس کی مثالیں مصطفےٰ زیدی کے ہاں بھی دیکھتے چلیں۔

دنیا میں مہ لقاؤں کی کوئی کمی نہیں
کس کس پہ جان دیجئے کس کس کو روئیے

☆

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

☆

تتلیاں اُڑتی ہیں اور ان کو پکڑنے کے لئے
سعیٔ ناکام میں اپنوں سے بچھڑ جاتے ہیں

☆

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی ہے
دنیا تو لطف لے گی مرے واقعات میں

☆

میرا تو جرم تذکرۂ عام ہے مگر
کچھ دھجیاں ہیں میری زلیخا کے ہاتھ میں

☆

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

☆

وہ داستاں تھی کسی اور شاہزادے کی
مرا لہو تھا فقط زیبِ داستاں کے لئے

☆

شہر کے کوچہ و بازار میں سناٹا ہے
آج کیا سانحہ گزرا ہے خبر تو لاؤ

☆

فگار پاؤں مرے اشک نارسا میرے
کہیں تو مل مجھے اے گمشدہ خدا میرے

☆

پلکوں پہ آکے رک سی گئی تھی ہر ایک موج

کل بد لئے تو آنکھ سے دریا اتر گیا

مصطفےٰ زیدی کی خود کشی کے بعد اس کی شاعری سے متعلق بہت سی آراء سامنے آئیں۔ ایک عمومی رائے یہ تھی کہ مصطفےٰ زیدی ایک عظیم شاعر تھا۔ ہمارا یہ رویہ' جس کی پیداوار یہ عمومی رائے ہے' اکثر بہت سی خرابیوں کا باعث بنتا ہے۔ ان خرابیوں کی وضاحت الطاف گوہر نے سعادت حسن منٹو پر مضمون لکھتے ہوئے کی تھی مثلاً "تعزیتی جلسوں کا کہا کہ کہ " مرحوم کی موت سے ایک خلا پیدا ہو گیا جو کبھی پر نہ ہو سکے گا" غرض اس قسم کی بے معنی باتیں۔

مصطفےٰ زیدی کے فکروفن کو جانچ پرکھ کر مستقبل کا ناقد اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا' اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات تو ہم کسی کے متعلق بھی نہیں کہہ سکتے کہ ماضی کے فراموش کردہ نام آج رائج کر دیے ہیں اور ماضی قریب کے کتنے بڑے نام یاد کرنے کے لئے ذہن پر زور دینا پڑتا ہے۔

○

حوالہ جات و حواشی

(۱) بہ حوالۂ " قطرے سے گہر ہونے تک " از سجاد باقر رضوی مطبوعہ " نئی قدریں " حیدر آباد' جدید شاعری نمبر

(۲) ایضاً

(۳) جرمن سے ترجمہ " خدا حافظ " آنسہ' خدا حافظ "

(۴) بہ حوالۂ "نقوش" لاہور' بابت ۱۹۶۸ء

(۵) بہ حوالۂ " الرحوم " مرتبہ اشرف قدسی مطبوعہ ۱۹۷۰ء

○

کہیں تو مل مجھے اے گمشدہ خدا میرے

مصطفےٰ زیدی کے مطابق: "ادبی ذوق کی اقدار پرکھنے سے پہلے یہ بات جان لینی چاہئے کہ ادب کا سوال بعد میں اٹھتا ہے اور ذوق کا پہلے' جو ادب ہم تک پہنچا ہے وہ تہذیب اور تمدن کا پالا ہوا ہے اور ذوق زندگی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تہذیب اور تمدن بھی ذوق کی تشکیل کے لوازمات ہیں لیکن اس کی بنیادی ہیئت میں زیادہ حصہ نسل ہی کا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ ادبی ذوق کو متعین کرنے والا سماج کا ایک حصہ ہوتا ہے' ادب کا نہیں۔ ذوق سماج کی ایک مخصوص حالت میں نشوونما پاتا ہے۔(۱)

مصطفےٰ زیدی نے "ادبی ذوق کا سوال" کے علاوہ ایک مضمون "تنقید پر تنقید" لکھا تھا جس میں تنقید کی ماہیت پر بات کرتے ہوئے تنقید کی تین قسمیں گنوائی تھیں یعنی پہلی قسم میں تنقید تخلیق بھی ہے' دوسری قسم وہ ہے' جو محض ترجمانی کرتی ہے اور تیسری قسم کی تنقید جانچتی اور پرکھتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کے ساتھ کہ ہر رائے لانا" تنقید نہیں ہوتی۔

ان مضامین کے علاوہ نجی خطوط میں یا "کوندا" کے حرف آخر کے عنوان سے مصطفےٰ زیدی نے جو کچھ لکھا ہے' وہ اس کی شاعری کا منشور ٹھہرتا ہے۔ جوش ملیح آبادی پر دو مضامین "شبیر حسن خان" اور "جوش اور ان کا فن" ۔۔۔۔ مولانا صلاح الدین احمد کے آخری سفر کی روداد" اے جانب از نظر" اور مجاز پر "مجاز' نورا' شمیم' امیر بھائی اور میں" مخصی خاکوں سے قریب تر ہیں۔ جبکہ پشاور ریڈیو کے لیے روا روی میں لکھے گئے مضامین کی ایک معقول تعداد کو مصطفےٰ زیدی نے خود Own نہیں کیا۔

"جوش اور ان کا فن" میں جوش کی شاعری کا جائزہ مختلف زاویوں سے لیا گیا ہے البتہ مضمون کا محور "شاعر انقلاب" جوش ہے جس کا نعرہ ہے "آگ' بجلی' موت میرا نام"۔

"شبیر حسن خان" میں مختلف یادداشتوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۴۹ء کی مختلف نشستوں کا احوال ہے' جن میں عرش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد بھی شریک

رہے۔ ۱۲۔ اے غائب از نظر" مولانا صلاح الدین احمد کی آخری سفر کی روداد ہے جب وہ قبولے (جامعہ اسلامیہ) کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لیے ہنستے مسکراتے لاہور سے منٹگمری آئے اور اگلے ہی روز لاتعداد دوستوں اور پرستاروں کو اشک بار چھوڑ، ہنسنے بولنے سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو کر گذر گئے۔

۱۳۔ "افکار" کراچی کے مجاز نمبر کے لئے مصطفےٰ زیدی نے کارڈف ویلز سے ایک مضمون لکھ کر بھیجا تھا "مجاز، لورا، شمیم، امیر بھائی اور میں" اس مضمون میں جوانی کے دنوں میں مجاز سے ملنے کی شدید خواہش سے لے کر ان کے ہاتھوں تنگ آکر چھپتے پھرنے تک کی عجب دلچسپ کہانی ملتی ہے۔

یادوں کے حوالے سے لکھے گئے یہ مضامین غموں اور خوشیوں کی دھوپ چھاؤں ہے۔

دسمبر ۱۹۶۰ء میں جب مصطفےٰ زیدی کا تبادلہ جہلم ہوا تو جہلم میں رائٹرز گلڈ کی شاخ کھلی رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام (بہ اشتراک نیشنل ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن) دو ماہی "شب تاب" کا پہلا شمارہ کیپٹن محمد ایوب پرنٹر و پبلشر نے تعمیر پرنٹنگ پریس راولپنڈی سے چھپوا کر دفتر رائٹرز گلڈ جہلم سے شائع کیا۔ پرچے کے نگران کے طور پر مصطفےٰ زیدی کا نام تھا۔

دستاویزی منظومات کے اس مجموعہ میں قدیم و جدید شعراء (ڈاکٹر تاثیر، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض) کی غزلیں۔ نظمیں اور رباعیات اس صورت میں شائع کی گئی تھیں کہ خود ان پر انہی شاعروں کی اصلاحیں بھی تھیں۔ مصطفےٰ زیدی کی تین نظمیں "سودا" "ہوش ربا" اور "وصال" پہلی بار اسی پرچے میں شائع ہوئیں۔ "شب تاب" میں استانزے" از جیلانی کامران، "مرگ آوارہ" از حبیب جالب اور "جنبشِ دوراں" از شور علیگ پر تبصرے بھی شامل تھے۔

اس مجموعے میں استاد ہاشم علی کے نادر مجموعہ کلام سے چند اقتباسات بھی شامل کیے گئے۔ اس مسودے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یہ نسخہ چار صدی پہلے کا ہے اور ہاشم علی، حاتم اور ولی دکنی کے پیش رو شعراء میں سے تھے، سلطان باہو (۱۶۳۹ء - ۱۶۹۱ء) اور استاد ہاشم کا زمانہ ایک ہے۔ یہ نادر نسخہ ایڈنبرا

یونیورسٹی لائبریری کا مسودہ نمبر۹ ۳/۳۸۵ ہے جسے جیلانی کامران نے ایڈنبرا میں قیام کے دوران نقل کیا۔

مقتدا وو جہانکا ہے نایاب
جس کا نانا نبی علی ہے باپ
روشنی بخش مسجد محراب
تھا قدم جس کا زیب ممبر کا
دیکھا بھائی کون رن دے اپی
موہ اوپر سون کون تب لے اپی
لی سکینا لکا کلی اپی
لہو بھرا تن علی اکبر کا

"شب تاب" کی اس خصوصی اشاعت کے بعد "ممنوعہ ادب نمبر" کا منصوبہ بنا جس میں قرآن حکیم اور بائیبل کو بھی شامل کرنے کا ارادہ تھا کہ مختلف زمانوں میں ان دو کتابوں پر بھی پابندی رہی ہے۔ لیکن یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔
۱۹۷۴ء میں جب مصطفےٰ زیدی کا تبادلہ منٹگمری (حال ساہیوال) ہوا تو ڈسٹرکٹ کونسل کے ہفت روزہ خبرنامے "منٹگمری گزٹ" کو اچھا خاصا ادبی پرچہ بنا دیا۔ اس کا نام "فردا" تجویز ہوا "فردا" کی دو خصوصی اشاعتیں یادگار حیثیت کی حامل ہیں۔ پہلی خاص اشاعت "مولانا صلاح الدین احمد نمبر" جو ان کی وفات کے فوراً بعد شائع کیا گیا اور اشاعتِ خاص' سال ۱۹۷۴ء۔ آخر الذکر خصوصی اشاعت میں مولانا جنوں کا فارسی کلام "سکینہ" کا پابند نظم میں ترجمہ از میر غلام احمد رضوی اور مصطفےٰ زیدی کی فوٹوگرافی کے نمونے خاص چیزیں تھیں۔
مصطفےٰ زیدی کے سیکڑوں اشعار اور کئی نظمیں ایسی بھی ہیں' جن کے بارے میں "موج مری صدف صدف" کے دیباچے میں اس نے خود لکھا ہے کہ:
"بیشتر ایسے اشعار ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتے ہیں اور کبھی نہیں چھپ سکتے"۔
ایسے اشعار چھپ نہیں سکتے اس لیے محفوظ بھی نہیں رہتے اور نہ ہی محفوظ رکھنے کے لئے کیے جاتے ہیں۔ لیکن مصطفےٰ زیدی کی لکھی ادا جعفری سے متعلق ہجویہ نظم کہاں

بولتی ہے اور پھر انتظار حسین کے بارے میں وہ شعر' جو ایک کثیر الاشاعت ادبی پرچے میں چھپ چکا ہے۔

سب کا نیتا ہے انتظار حسین
سب کو دیتا ہے انتظار حسین

اب بات چل نکلی ہے تو "سالگرہ" کا تذکرہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ دبیز آرٹ پیپر پر خوبصورت ٹائپ میں چکنے کاغذ کے رنگین سرورق کے ساتھ' جس پر اس وقت کی نمایاں فلمی اداکاراؤں کی تصاویر تھیں' کل پینتیس صفحات کا کتابچہ تھا' جسے مصطفےٰ زیدی نے مرتب کیا۔ اندر کا مواد چند اعلیٰ افسروں اور ان پری وشوں کے شب باشی کے قصے اور وہی دہانوی کا انداز تحریر۔

ایک مدت تک "سالگرہ" کا چرچا پاک ٹی ہاؤس اور لاہور کے ادبی حلقوں میں رہا اور یہ مختصر کتابچہ ان بھلے وقتوں میں پچیس روپے تک کا ہاتھوں ہاتھ بکا۔ اس سلسلے میں مصطفےٰ زیدی اور شہناز گل کی پوسٹ کارڈ سائز رنگین عریاں تصاویر اور ان چار ہزار پمفلٹوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جن پر شہناز گل کی دو عریاں تصاویر تھیں اور اس کے خاوند کے علاوہ چند دیگر افراد کے متعلق فحش تحریری مواد تھا (۲)

مصطفےٰ زیدی کی ان دلچسپیوں اور مجبوریوں کے بارے میں اس لیے بھی بات کرنا ضروری ہے کہ یہ معاشرہ بنیادی طور پر بقول مصطفےٰ زیدی' "قصابوں کا معاشرہ" ہے اور جس کے بارے میں ویرا زیدی نے پاکستان سے جرمنی کا سفر اختیار کرتے وقت کہا تھا:

"مجھے آپ کے معیار یا نقطہ نظر کا تو علم نہیں لیکن میرے لیے اس المیہ کو فراموش کر دینا ممکن نہیں۔ ہر چند کہ وقت بہت ساری بلاؤں کا رد اور حافظے کا قاتل ہے۔ لیکن میں نے آپ کے معاشرے سے جو کچھ سیکھا ہے وہ میرے لئے بھولنا ناممکن ہے۔ (۳)

ویرا زیدی جن باتوں کی وضاحت نہیں کر سکیں ان کی تشہیر کا خوف اپنی جگہ گمبھیر ہے اور جرم برائی نہیں بنتا۔ ہم منافق ہیں وہ کچھ لوگوں کے سامنے نہیں کہہ پاتے کہ جو ہمارا جی چاہتا ہے۔ جبکہ ہمارے شاعر نے ہمیشہ بات کا بتنگڑ بنانے والوں پر

تین حرف بھیجتے ہوئے صرف اور صرف دل کی بات ملتی۔

مصطفےٰ زیدی نے اپنے دکھ اور سکھ بانٹے ہیں۔ اس نے مختلف مواقع پر یادگار خوبصورت ڈائیریاں چھپوا کر دوستوں میں تقسیم کیں۔ اب تک مجھے ایسی دو قسم کی ڈائریاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جن میں سے ایک میں ہر صفحے کے ساتھ مصطفےٰ زیدی کی اتاری ہوئی ایک ایک تصویر شامل تھی۔ اس ڈائیری پر طباعت کی تاریخ درج نہیں۔ دوسری ڈائری ۱۹۶۸ء میں عید کے موقع پر مصطفےٰ زیدی نے دوستوں کو بھجوائی۔ یہ سنہری حاشیہ کے ساتھ کشتی رنگ کی پاکٹ سائز ڈائری تھی جس کے ایک طرف مصطفےٰ زیدی کی اپنی ایک تصویر اور یہ چار لائنیں درج تھیں:

دن کی اک اک بوند گراں ہے
اک اک جرعۂ شب نایاب
شام و سحر کے پیمانے میں
جو کچھ ہے ڈر ڈر کے پیو

فوٹو گرافی کے شوق کے بارے میں مصطفےٰ زیدی نے خود لکھا:

"میں نے شاعری کے علاوہ کئی روگ پالے' فوٹو گرافی شروع کی تو جنون کی حد تک' میرے سر پر دنیا کے ہزاروں شہروں کی دھوپ اور برف پڑی اور میں جلتی ہوئی یا ٹھٹھرتی ہوئی انگلیوں سے متحرک اور جامد کیمرہ چلاتا رہا"۔(۳)

ایک مدت تک مصطفےٰ زیدی کا اپنا فوٹو اسٹوڈیو اور ڈارک روم بھی رہا اور تصویر مصوری کی۔ آخری مجموعہ کلام "کوہ ندا" کا سرورق مصطفےٰ زیدی نے خود بنایا تھا۔

ایک زمانے میں غالباً" ۱۹۵۴ء کی ابتداء تھی اور بے روزگاری کا زمانہ' مصطفےٰ زیدی نے ریڈیو کے لیے صداکاری بھی کی۔ خاص طور پر ایک ریڈیائی ڈرامہ (اسٹیونس کی کہانی اور برہان الدین حسن کا ترجمہ) دوستوں کو یاد رہے گا۔ جس میں اس نے صداکاری کرتے ہوئے وہ کردار ادا کیا جو ہالی وڈ کی ایک فلم میں چارلس لافٹن نے ادا کیا تھا۔

مصطفےٰ زیدی نے نظیر اکبر آبادی کی کلیات مرتب کی تو آسی کے بنائے ہوئے Dots کے علاوہ سیکڑوں نادر بند اور اشعار تلاش کر کے شامل کر دیے۔ پھر نظیر کا

انتخاب کیا تو حق ادا کر دیا۔ نہ نظیر کی کلیات چھپی اور نہ ہی "میری لائبریری" والوں نے جو انتخاب چھاپنا چاہا تھا' اب تک چھپ کر سامنے آسکا ہے۔

مصطفےٰ زیدی ہر محفل کی جان رہا ہے۔ فی البدیہہ جملہ بازی اور بات سے بات پیدا کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ایک بار پاک ٹی ہاؤس لاہور میں سجاد باقر رضوی' انتظار حسین اور دیگر احباب کی موجودگی میں اس نے منیر نیازی سے تازہ غزل کی فرمائش کی۔ منیر نیازی نے ابھی پہلا مصرع ہی پڑھا تھا۔

مثالِ سنگ کھڑا ہے اُسی حسیں کی طرح

مصطفےٰ زیدی دونوں ہاتھ اٹھا کر بے تحاشا داد دینے لگا "واہ خانصاب' کیا مصرع ہے' مثالِ سنگ کھڑا ہے ـــــ واہ وا"

یہ منیر نیازی کی غزل کا مطلع تھا

مثالِ سنگ کھڑا ہے اُسی حسیں کی طرح
مکاں کی شکل بھی دیکھو ملکیں کی طرح

(ماہِ منیر)

اُس کی باغ و بہار شخصیت کا احوال دوستوں کے نام خطوط میں کھُلتا ہے۔ مسعود اشعر کو ایک خط میں لکھا:

"مسعود بھائی' اتفاق دیکھو کہ دو راتوں سے تم برابر خواب میں آ رہے ہو۔ گو تمہاری شکل کاؤنٹ ڈریکولا سے ملتی جلتی تھی اور تمہیں خط لکھنے کا حادثہ آج کل میں وقوع ہونے والا ہی تھا کہ تمہارا محبت نامہ آگیا۔ اسے کہتے ہیں عشقِ صادق (ہائے عشقِ دُخترِ صادق)"۔(۵)

ابن انشاء کے نام ایک خط ہے:

"انشاء میاں آپ ہمارے تار کے شدتِ طلب سے سلگتے ہوئے الفاظ کے باوجود تشریف نہیں لائے۔ ارے بھائی دور دور کے تعلق والے ہو۔ جو سلوک دوسرے ہمارے ساتھ کرتے ہیں وہی تم بھی روا رکھتے ہو۔ بیشک یہاں آکر شعر نہ پڑھتے' کوئی جبر تو نہ تھا' اب تو آپ پر جبر کرنے کے لئے نہ آپ کی عمر رہ گئی ہے نہ ہماری۔ مشہور و معروف استاد اختر انصاری (نقلی) تشریف لائے تھے' کہنے لگے "نئی قدریں" کا جدید

ادب نمبر نکال رہا ہوں۔ ہم نے کہا ہمارا تو پرانا ہو گیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہنے لگے ابن انشاء آپ کے خفیہ حالات لکھ رہے ہیں۔ ہم نے کہا انھوں نے صرف بند دروازے دیکھے ہیں یا شاید ہمارے جسم میں جو لعبتانِ عالم کی خوشبو رچ گئی ہے' اس کی کچھ باس پا گئے ہیں۔ یہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کے دو تین خط پڑے تھے لے گئے ہیں۔ ہم نے کہا بے شک چھاپو' انھیں بھی رسوا کرو' ہمیں بھی رسوا کرو"۔(۶)

مسعود اشعر کے نام لکھے گئے ایک خط سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"مظفر قادر کو ہمارا سلام کہئے گا۔ آج کی ڈاک سے ہم سلیم نیازی کو ایک کارڈ بھیج رہے ہیں جو دیدنی ہے۔ وہ چھاپے گا مگر آپ اور مظفر قادر پیچھے پڑ کر دیکھ ہی ڈالیں۔" (۷)

ان ہنستے مسکراتے اور چٹکیاں لیتے خطوط کے ساتھ ساتھ سوگوار مصطفےٰ زیدی کو بھی دیکھتے چلیں۔ جوش ملیح آبادی کے نام ایک خط دیکھیے:

"جہاں میں نے دشمنوں کی ایک تعدادِ کثیر اپنے چاروں طرف جمع کر لی ہے۔ وہاں دوستوں کے حلقے میں کوئی ایک آدمی بھی نہیں دکھائی دیتا۔ مجھے رات کے اس جنگل میں چاروں طرف سے جو افریقی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کو تنہا برداشت کرنے کا حوصلہ اب میں اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ خدا کرے میری زندگی کے باقی تمام دن آپ کے حساب میں جمع ہو جائیں۔ لیکن کس کی کون سی دعا قبول ہوتی ہے جو اس دعا کے مستجب ہونے کی توقع کی جا سکے۔"(۸)

بنام ابن انشاء:

"میں سمجھتا ہوں کہ کسی کو خفا کر دینا کسی کو افسردہ کر دینے سے بہتر ہے اور مدت دراز سے "افسردہ کند انجمنے را" کا ایسا برا وصف مجھ میں پیدا ہو گیا ہے کہ مجلس' نشست و برخاست کے تمام آداب میں بھلا بیٹھا ہوں۔ آپ کا پہلا خط آیا تو میں ارادتاً" خاموش رہا کہ آپ ناراض ہو جائیں گے اور میں عزیز دل و جاں کو صدمہ آزردگی پہنچانے سے بچ جاؤں گا۔ اب دوسرا خط آیا تو میں ڈرا ہوں کہ آپ مجھ سے ابھی تک مایوس نہیں ہوئے۔ خدارا یہ قلندرانہ شان مت دکھایئے ورنہ میں ٹکڑے

ٹکڑے ہو جاؤں گا۔"(۹)

☆

حوالہ جات و حواشی:

(۱) بہ حوالہ "ادبی ذوق کا سوال" از مصطفیٰ زیدی
(۲) ذرگب یروڈ تھانے میں لکھوائی گئی ابتدائی رپورٹ۔ ۵ نومبر ۱۹۷۰
(۳) اخباری بیان۔ ۲۴ نومبر ۱۹۷۰ء
(۴) بہ حوالہ "حرف آخر" مشمولہ "کوہ ندا"
(۵) مکتوب بنام مسعود اشعر، محررہ ۹ جنوری ۱۹۶۰ء کوہ مری
(۶) مکتوب بنام ابن انشاء محررہ ۳ جون ۱۹۶۵ء منٹگمری
(۷) مکتوب بنام مسعود اشعر محررہ ۳ مئی ۱۹۶۷ء لندن
(۸) مکتوب بنام جوش ملیح آبادی محررہ ۲۱ جون ۱۹۶۹ء لاہور
(۹) مکتوب بنام ابن انشاء محررہ ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء

○

ٹکڑے ہو جاؤں گا۔"(۹)

☆

حوالہ جات و حواشی:

(۱) بہ حوالہ "ادبی ذوق کا سوال" از مصطفےٰ زیدی
(۲) ورگس روڈ تھانے میں لکھوائی گئی ابتدائی رپورٹ ۔ ۵ نومبر ۱۹۷۰
(۳) اخباری بیان ۔ ۲۳ نومبر ۱۹۷۰ء
(۴) بہ حوالہ "حرف آخر" مشمولہ "کوہِ ندا"
(۵) مکتوب بنام مسعود اشعر، محررہ ۹ جنوری ۱۹۶۲ء کوہ مری
(۶) مکتوب بنام ابنِ انشاء محررہ ۳ جون ۱۹۶۵ء منٹگمری
(۷) مکتوب بنام مسعود اشعر محررہ ۲ مئی ۱۹۶۷ء لندن
(۸) مکتوب بنام جوش ملیح آبادی محررہ ۲۶ جون ۱۹۶۹ء لاہور
(۹) مکتوب بنام ابنِ انشاء محررہ ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء

○

1

انتخاب : زنجیریں

مطبوعہ سنگم پبلشنگ ہاؤس الٰہ آباد (بھارت) طبع اول: جولائی ۱۹۴۷ء
دیباچہ: رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری' محررہ ۱۳ جولائی ۱۹۴۷ء کتاب کا انتساب "س" کے نام ہے —— جس سے مراد سروج بالا سرن ہے۔ کتاب کے سرورق پر ایک شعر درج ہے:

قدر فرما تیغؔ کی اے دخترِ گنگ و جمن
تیغؔ جو اس وقت ہے پیغمبرِ شعر و سخن

اس مجموعے پر مصطفےٰ زیدی کا نام تیغ الہ آبادی درج ہے۔ "زنجیریں" سے پہلے اس مجموعے کا نام "روحِ عصر" رکھا گیا تھا جو بعد میں تبدیل کر دیا گیا۔ پاکٹ سائز کا دبیز زرد کاغذ پر چھپا ہوا یہ مجموعہ قطعات پر مشتمل تھا۔ بقول مصطفےٰ زیدی یہ ۱۹۴۵ء تک کے کلام سے انتخاب ہے۔

عبادتِ زندگی

برف کے نم اُداس سینے پر
رقص کرتی ہے شوخی میری
موت کا راگ چھیڑ کر اے دوست
مسکراتی ہے زندگی میری

○

کون؟

گالوں کے خوشنما دُھندلکوں میں
ہو گیا گم ہر اک حسیں سایہ
کوئی آواز دے رہا ہے مجھے
ہم نے سایوں میں تجھ کو دیکھ لیا

○

وداع

آج وقتِ وداع اے ہمدم
میری آنکھوں میں اشک بھر آئے
ہٹ گیا کوئی یوں ہٹا کر چلمن
جیسے بادل میں چاند چھپ جائے

○

مجسم نغمگی

سانس لیتی ہے جب وہ غنچہ نفس
جاگ پڑتی ہیں سانس کی تانیں
یوں چھلکتا ہے نقرئی سینہ
جیسے سنگیت کی حسیں لہریں

ناراضگی بے سبب

یاد جب آتی ہیں کالج کی سہانی راتیں
اور نم کرتی ہیں پھر وہ مری چشمِ نم کو
کوئی سر رکھ کے مرے دوش پہ یہ کہتا ہے
کس لئے روٹھ گئے کچھ تو بتا دو ہم کو

○

کالج نوٹ بک میں

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کسی کی تصویر
آج الجھے ہوئے اوراق میں میں نے دیکھی
جھک گئے میرے لرزتے ہوئے تپتے ہوئے ہونٹ
اور تصویر کے چہرے پہ حیا دوڑ گئی

○

دعوتِ جمال

کتنی رنگین رُت یہ آئی ہے
کھل اٹھے پھول ہنس پڑے گلشن
گاؤں سے خط لکھا ہے انجم نے
تم بھی آؤ کہ آگئے ساون

○

ایک خط

یوں ہی ناراض ہو گئے مجھ سے
[illegible] کے مالک مری بھی بات سنو
میں تمہیں ایک پل بھی گر بھولوں
تم مجھے عمر بھر نہ یاد کرو

○

شکوۂ خلوص

مدتوں بعد ہوا میرا گزر اے ہمدم
اس جگہ جس کو ملک مہر کہیں ماہ کہیں
مجھ سے روٹھی ہوئی آواز میں انجم نے کہا
اب بھی کیوں آئے یہاں کس نے بلایا تھا تمہیں

○

آؤ سو جائیں

کوہساروں پہ چھا گیا ہے سکوت
آبشاروں کی آنکھ میں ہے نمی
چاند بھی چھپ گیا ہے بادل میں
آؤ سو جائیں رات بھیگ چلی

○

بُعدالمشرقین

حسرتوں کے چراغ بجھتے ہیں
غم کی مشعل جلائی جاتی ہے
عشق ہے اور شب کا سناٹا
حُسن کو نیند آئی جاتی ہے

۲

انتخاب : روشنی

مطبوعہ مکتبہ حیاتِ نو' الہ آباد(بھارت) طبع اول: ۱۹۴۹ء

(بہ ترمیم و اضافہ) مکتبہ ادب جدید' لاہور(پاکستان) طبع دوم: ۱۹۶۰ء

دیباچہ بعنوان "چراغ آفریدم" از مصطفیٰ زیدی

کتاب کا انتساب : پریم کمار جین کے نام ان الفاظ میں تھا:

ترے جمال کو احساسِ درد ہو کہ نہ ہو
بجھے ہوئے ہیں ترانے' ستار زخمی ہے

حیات سوگ میں ہے بے زبان دل کی طرح
کہ نوجوان امنگوں کے ہار زخمی ہیں

سرورق کا رنگ سُرخ تھا' جس پر ہتھوڑے اور درانتی کے نشانات سے "روشنی" لکھا تھا۔

شطرنج

عزیز دوست مرے ذہن کے اندھیرے میں
ترے خیال کے دیپک بھڑک رہے ہیں
کہاں سے ہو کے کہاں تک حیات آپہنچی
اداس پلکوں پہ تارے چھلک رہے ہیں

ترے جمال کو احساسِ درد ہو کہ نہ ہو
بجھے پڑے ہیں ترانے ستار زخمی ہیں
حیات سوگ میں ہے بے زبان دل کی طرح
کہ نوجوان امنگوں کے ہار زخمی ہیں

تجھے یہ رقصِ مسلسل کا دور راس آئے
تری نگاہ میں گاتا رہے یوں ہی افسوں
مرے شعور کی اس خامکار دنیا نے
خرد کی چال کو دل کی پکار سمجھا تھا

یہ میری اپنی خطا تھی کہ بزمِ ہستی میں
مرا خلوص سیاست کو پیار سمجھا تھا
ترا دماغ سلامت رہے کہ اس کے عوض
ترے حضور میں کل کائنات ہے ساتھی

ابھی جو کل مرے دکھ درد کا مداوا تھی!
وہ آج تیری شریکِ حیات ہے ساتھی

رقیب

سنا تم نے زیدی کا کردار کیا ہے
ثنا خوانِ ابلیس و بدخواہ یزداں

وہ خانہ بدوشے زخانہ بدوشاں
وہ آوارہ گردے ز آوارہ گرداں

وہ مصروف طاعت گزاریٔ نغمہ
وہ محو سجودِ نگارانِ رقصاں

وہ جس کا تکلم، وہ جس کا ترنم
حدی خوئیِ کاروانِ حسیناں

سسکتا ہوا خود فریبی کا بادل
گرجتا ہوا جہل و وحشت کا طوفاں

نمازوں میں دیکھا نہ روزوں میں دیکھا
نہ صبحوں کو خنداں نہ راتوں کو گریاں

کبھی انقلاب اور بغاوت کا شعلہ
کبھی دودِ گرمِ دلِ نازنیناں

نہ اندازِ حکمت نہ آثارِ دانش!
فقط عکسِ مہ پارۂ مہ جبیناں

نہ لہجہ ہی ساکن نہ نغمہ ہی مدھم
فقط برق و آتش فقط ابر و باراں

اسے کیا ثواب و طہارت سے مطلب
وہ شاہِ صبوحی شہنشاہ رنداں

یہی ہے تمہارے پجاری کا چہرہ؟
یہی ہے وہ سرکردۂ خوشہ چیناں؟

یہی ہے وہ شہ پارۂ آلِ سید؟
یہی ہے وہ تفسیرِ خونِ شہیداں؟

یہی ہے وہ نازش گرِ ہوش و تمکیں؟
یہی ہے وہ پروردۂ ابرِ وباراں

یہی ہے وہ جس سے محبت کا سینہ
فروزاں فروزاں چراغاں چراغاں؟

یہی ہے حریفِ نجوم و کواکب؟
یہی ہے مثالِ مہ و مہرتاباں؟

یہی ہے کلاہِ شہنشاہ خاور؟
یہی ہے وہ تاجِ بندگی کا سلیماں؟

یہی ہے کہ جس کی قلم رو میں آکر
ہر اک حرف روشن ہر اک لفظ رقصاں؟

یہی ہے شرر ریزیٔ رنگ و رونق؟
یہی ہے گہر باریٔ ابرِ نیساں؟

یہی ہے دماغ و کفِ اہلِ دانش؟
یہی ہے دل و دیدۂ دل نشیناں؟

یہی ہے وہ قرطاس پر عکسِ عظمت؟
یہی ہے وہ گفتار میں لطفِ الحاں؟

کہاں یہ تمہاری محبت کے قاتل

تم اس شخص کو بھول جاؤ مری جاں
اور اس بات کو جب کئی دن گزر لیں
تو اے صدرِ بزمِ نگارانِ دوراں
مری سمت بھی اک نگاہِ عنایت!
مرے ساتھ بھی ایک چھوٹا سا پیماں !

جسم کی بے سود پکار

آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساتھی
ورنہ اس رہ پہ' ذرات ہیں پامال جہاں

اس کی آنکھوں میں تھی انجان ستاروں کی تلاش
کھیلتے' گھومتے' گنگناتے دھاروں کی تلاش
جھومتے' ڈولتے' خاموش اشاروں کی تلاش

آج آنکھوں میں تڑپ تھی نہ اشارا ساتھی
یہ نہیں ہے کہ اسے شوقِ خود آرائی تھا

اک تمدن کی کہانی تھی وہ بے نام نگاہ
جس میں مشرق کا تقدس تھا نہ مغرب کا گناہ
جس کے کوچے سے گزرتی ہے روایات کی راہ

جس کے قدموں سے لپٹتا ہے زمانہ ساتھی
تال دے اٹھتی تھیں یوں اس کے قدم پر راہیں

جیسے برسات کے پانی میں چھلکتے جھانجن
جیسے کرنوں سے جھمک جائے کسی کا کنگن
جیسے کلیوں کے طرب زار میں جھولے ساون

جیسے جنت کے جزیرے میں سویرا ساتھی
اس سلگتے ہوئے مشرق کے دریچے کے قریب

اکثر اوقات مرے دل میں حرارت آئی
مرے جینے پہ کئی بار قیامت آئی
مری آنکھوں میں کئی بار جسارت آئی

اس کی نظروں نے کئی بار پکارا ساتھی
لیکن اس فکر کا انجام عمل ہو نہ سکا

مئے بے باک نہ ہو جس میں تو وہ خُم کیا ہے
خاموش نگاہوں کا تصادم کیا ہے
پیار کرتی ہوئی رُوحوں کا تکلم کیا ہے

جس کو حاصل نہ ہو لفظوں کا سہارا ساتھی
اب تو یہ فکر بھی بے کار ہے یہ غم بھی فضول

کہ اسے مجھ سے بہر طور محبت بھی نہ تھی
کہ اس انجمن کا سبب کوئی رقابت بھی نہ تھی
آج تو اس کی نگاہوں میں حقارت بھی نہ تھی

آج تو مڑ کے بھی اُس نے نہیں دیکھا ساتھی

دیوانوں پہ کیا گزری

صرف دو چار برس قبل یونہی بر سر راہ
مل گیا ہوتا اگر کوئی اشارا ہم کو
کسی خاموش تکلم کا سہارا ہم کو
کسی دزدیدہ تبسم کسی چہرے کی پکار

یہی وعدہ یہی ایمائے مبہم اقرار

ہم اسے عرش کی سرحد سے ملانے چلتے
پھول کہتے کبھی سنگیت بنانے چلتے
خانقاہوں کی طرف دیپ جلانے چلتے

صرف دو چار برس قبل!! مگر اب یہ ہے
کہ تری نرم نگاہی کا اشارا پاکر
کبھی بستر بھی کرے کا خیال آتا ہے
زندگی جسم کی خواہش کے سوا کچھ بھی نہیں
خون میں خون کی گردش کے سوا کچھ نہیں

آواز کے سائے

پتہ نہیں تم کہاں ہو یارو
ہماری افتادِ روز و شب کی
تمہیں خبر مل سکی کہ تم بھی!!
رہینِ دستِ خزاں ہو یارو
دونوں میں تفریق مٹ چکی ہے
کہ وقت سے خوش گماں ہو یارو
ابھی لڑکپن کے حوصلے ہیں
کہ بے سرو سائباں ہو یارو
پہنچ چکے ہو فرات تک یا
سراب کی داستاں ہو یارو
ہماری افتادِ روز و شب میں
نہ جانے کتنی ہی بار اب تک
دھنک بنی اور بکھر چکی ہے!

عروس شب اپنی زمیں سے
سحر کو محروم کر چکی ہے
دہکتے صحرا میں دھوپ کھا کر
شفق کی رنگت اتر چکی ہے
بہار کا تعزیہ اٹھائے
نگار یک شب گزر چکی ہے
امید نو روز ہے کہ تم بھی
بہار کے نوحہ خواں ہو یارو

ہر اک کو آواز دے رہا ہے
خفا ہو، یا بے زباں ہو یارو
تمہاری یادوں کے قافلے کا
تھکا ہوا اجنبی مسافر

۳

انتخاب : شہر آزر

مطبوعہ: لاہور اکیڈمی، لاہور (پاکستان) طبع اول: جنوری ۱۹۵۸ء
دیباچہ بعنوان: "اپنا دیواں بغل میں داب کے میر" از مصطفیٰ زیدی
کتاب کا انتساب — ویرا فان مل کے نام ——

یہ مجموعہ "دھرتی کے گیت" کے نام سے پربھات پبلیشرز، الہ آباد (بھارت) سے شائع ہونا تھا، لیکن ۱۹۵۱ء کے اواخر میں مصطفیٰ زیدی کی بھارت سے پاکستان منتقلی کے سبب یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

میں امن چاہتا ہوں

شکنتلا تم بتا سکو گی
میں کتنے اشکوں کو اپنی پلکوں میں روک کر مسکرا رہا ہوں
مرے شکستہ اداس بربط کے تار ٹوٹے ہوئے پڑے ہیں
مگر میں اب تک اسی مسرت کی چھاؤں میں گنگنا رہا ہوں
شکنتلا تم بتا سکو گی، میں رو رہا ہوں کہ گا رہا ہوں

تمہاری باتیں مرے ہر اک گیت کے لبوں پر اتر چکی ہیں
تمہاری راکھی مری کلائی میں آج بھی جگمگا رہی ہے
تم اپنے بھائی کی بات رکھ لو
تمہارا بھائی خلوص کی بھیک کے لئے دربدر گیا ہے
اسے محبت بھی مل چکی ہے
اسے ہزاروں دلوں سے اک بیکراں عقیدت بھی مل چکی ہے
نگار خانے بھی سج چکے ہیں
چھلکتے نغموں کی بزم پر سبز شامیانے بھی تن چکے ہیں
مگر ابھی تک وہ دل کی بے لوث چاندنی کو ترس رہا ہے
اسے رفاقت نہیں ملی ہے
اسے محبت تو مل چکی ہے، مگر صداقت نہیں ملی ہے

میں اکثر اوقات ذہن کی بے پناہ الجھن میں سوچتا ہوں
یہاں صداقت کہاں ملے گی
یہ چاند کے خوشگوار چہرے کے گرد اتنے اداس ہالے
یہ دور سے نو عروس کمرے، یہ پاس سے مکڑیوں کے جالے
اذان کے بعد اس کا رونا کہ بال و پر میں تو کچھ نہیں ہے
یہ سرج کے سوٹ اور یہ سوچنا کہ گھر میں تو کچھ نہیں ہے
یہ چند پیسوں کے واسطے مگر کس لئے ہیر پھیر کیوں ہے

یہ چھوٹے چھوٹے گھروں میں سل اور دق کے کیڑوں کا ڈھیر کیوں ہے

خدا کے فضل و کرم سے ہم آج بھی اجالے سے ڈر رہے ہیں
ہماری نسلیں۔ ہمارے بچے غلاظتوں میں ابھر رہے ہیں
یہاں صداقت کہاں ملے گی؟

تمہارے کمرے کی جتنی چیزیں ہیں مجھ کو حیرت سے دیکھتی ہیں
یہ اجنبی تو نہیں ہے کوئی!
مگر نہیں' آئینے میں خود میری اپنی صورت جھلک رہی ہے
یہ عکس میرے ہی جسم کا ہے
یہ نرم چنگاریاں مرے اپنے ساز ہی سے نکل رہی ہیں
مگر مجھے آج اس کا ڈر ہے
کہیں یہ چنگاریاں ہی کمرے کی رونقوں کو جلا نہ ڈالیں
کہ ان کی معصوم پھلجھڑی میں دہکتے لمحوں کی آنچ بھی ہے
دہکتے لمحے جو آچکے ہیں
دہکتے لمحے جو دوسری جنگ کے زمانے میں آچکے ہیں
دہکتے لمحے جو خیر سے اپنے ملک میں دور ہی پہ ناچے
جنہوں نے بنگال کی زمیں پر ہی اکتفا کی
اگر کہیں پھر یہ آگ لپکی
تو اسکی زد سے ہماری تہذیب کی بہاریں نہ بچ سکیں گی
تمہیں تو یہ بات یاد ہوگی
کہ دوسری جنگ ہی میں پانی کے بدلے کیچڑ پیا گیا ہے
غذا کے بدلے سپاہیوں کو غلاظتیں پھانکنی پڑی ہیں
شکستگی' بے بسی میں چمڑے کی پیٹیاں چاٹنی پڑی ہیں
ہزاروں مائیں جوان بچوں کے واسطے خون رو چکی ہیں
ضعیف باپوں کے تھرتھراتے ہوئے قدم سرد پڑ چکے ہیں
سہاگنوں کی نگاہیں دولھا کی واپسی کو ترس چکی ہیں
سسکتی بہنوں نے بھائیوں کو کفن پہنا کر جدا کیا ہے!

اگر پھر اس بار جنگ ہوگی

تو آدمیت نوکیلے بُوٹوں کی ٹھوکروں سے لرز اٹھے گی
تمہارے گھر کے برآمدے میں چشختی اینٹوں کے ڈھیر ہوں گے
تمہارے شوہر کا جسم سیسے کی گولیوں سے فگار ہو گا
تمہاری بچی سے لوگ اس کی ذرا سی گڑیا بھی چھین لیں گے
تمہارے بچے کے ہاتھ میں دودھ کا کٹورا نہیں رہے گا
تمہاری الماریوں پہ رکھی ہوئی کتابیں نہیں رہیں گی
تمہارے چولہے میں لکڑیوں کے عوض تمہارا بدن جلے گا
تمہاری اپنی زمیں جلے گی' تمہارا اپنا وطن جلے گا
تمہارے تکیے پہ کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے نہیں رہیں گے
تمہارے آنگن کی رسیوں پر سفید کپڑے نہیں رہیں گے
تمہارے بھائی کا ساز گر جائے گا ستاروں کی آہ بن کر
تمہارے بھائی کے گیت جم جائیں گے تمہاری کراہ بن کر

یہ بات تم تک نہیں رہے گی
یہ زہر دھرتی کی ایک اک نس میں گھل کے ہر جڑ کو کاٹ دے گا
یہ زہر رگ رگ کو چاٹ لے گا
زمین گیہوں نہیں جنے گی
کہ اس کے ہونٹوں پہ آدمی کے لہو سے پپڑی جمی ہوئی ہے
ملوں میں کپڑا نہیں بنے گا
کہ تکلیوں کو گھمانے والوں کی انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں

اور اب کے وہ اسلحے بھی ہوں گے
زمین ہی کو نہیں جو گہرے سمندروں کو بھی راکھ کر دیں
اذیتیں جن کو سوچنے ہی سے آدمی کانپ کانپ اٹھے
ہزاروں بم جو لہکتے کھیتوں کو خاک کر دیں' جلا کے رکھ دے دیں
ہزاروں گیسیں جو آدمی کے بدن کی ہڈی گلا کے رکھ دیں
اجاڑ سنسان شاہراہوں پہ ڈگمگاتا ہوا تمدن
سڑی ہوئی آدمی کی لاشوں کے تیز بھبکوں سے جل اٹھے گا

لہو کی بھٹی میں گرم تانبے کے سرخ سکے ڈھلا کریں گے
سمندروں کی عظیم لہروں میں تار پیڈو چلا کریں گے
جنوں کے جبڑوں میں پس کے رہ جائیں گی نئی ہونہار نسلیں
امیر خسرو کے مقبرے میں اگر کی بتی نہیں جلے گی
عظیم غالب کے اجڑے مسکن میں بیر کے پیڑ بھی نہ ہوں گے
کبیر کے بے پناہ دوہوں کے گانے والے نہیں رہیں گے
کرشن اور پریم کی کہانی کو باڑھ کے تار گھیر لیں گے
فراق اور جوش کا ترانہ بکھر کے رہ جائے گا خلا میں

یہ بمبئی کے حسین ساحل
سجی ہوئی لکھنؤ کی سڑکیں
دھلی ہوئی تاج کی عمارت
وسیع دلی میں اوکھلا اور چاندنی چوک کے مناظر
انہی مناظر پہ آدمی کے لہو سے سنج و مسا بنیں گے
انہی مناظر پہ جانے کتنے تباہ ہیرو شیما بنیں گے
اودھ کی شامیں دراز زلفوں کی یاد میں مضمحل رہیں گی
جوان کاشی کی صبح ڈھونڈے گی اور ماجھی نہیں ملیں گے
اداس سنگم کے گیت نوحوں کے روپ میں چیختے پھریں گے
ہوائیں ٹکرائیں گی درختوں سے جیسے روحیں بھٹک رہی ہوں
درخت ٹکرائیں گے چٹانوں سے جیسے شمشان جل رہے ہوں
چٹانیں ٹکرائیں گی خلاؤں سے جیسے بھونچال آ رہا ہو

میں آدمیت کو پوجتا ہوں
مرے ترانوں میں قوس اور کہکشاں کی انگڑائیاں نہیں ہیں
مری عقیدت زمین کے ایک ایک ذرے کو چومتی ہے
میں جانتا ہوں کہ آج فطرت پہ جیت انسان ہی کی ہو گی
عظیم انسان جس نے اپنے پرانے کپڑے بدل لیے ہیں
جو ارتقا کے کروڑوں زینوں کو آج تک پار کر چکا ہے

میں ڈر رہا ہوں کہیں یہ رفتار جنگ سے ست ہو نہ جائے
اٹھو مقدس زمین سے ہم تمام انسان عہد کر لیں
کہ اپنے اس تیز ارتقاء کے لئے ہمیں جنگ روکنی ہے
یہ عہد جس روز جنگ بازوں سے اپنا لوہا منا سکے گا
تمام سنسار گا سکے گا
ہماری نسلیں ہمارے بچے نفاستوں میں ابھر سکیں گے
یہاں رفاقت بھی مل سکے گی
یہاں صداقت بھی مل سکے گی

○

گرب اسٹریٹ کی کہانی

(ایک فینٹیزیا)

آ' اے جنوں کہ ہم بھی جلائیں نئے چراغ
آ' اے خیال' ہم بھی ذرا دو قدم چلیں
اس اونگھتی سڑک کے کناروں کو چھوڑ کر
تاروں کو' جوئبار کے دھاروں کو چھوڑ کر
آ' اے جنون کہ ہم بھی ....

○

ابتدا:

"سودا پہ جب جنوں نے کیا خواب و خور حرام
لائے گھر اس طبیب کے ہے عقل جس کا نام
احوال اس کا دیکھ کے کہنے لگے طبیب
اب فصد و مسہل اس کے لیے ہے مفید تام"

○

خفگی:

سنتے ہیں اک بزرگ نے اپنے مزار سے
شہنائیوں کا شور سنا اور بگڑ گئے
ہاں دلبرو' اب اور نہ عشاق کو ستاؤ
اس دن سے خوف کھاؤ کہ جب ہم اکڑ گئے

○

رنگ سخن:

گھوڑے کا حال لکھتا ہوں' حضرات ہوشیار
کاغذ پہ پہلے کرتا ہوں دو قافیے سوار
اک قافیہ بہار ہے' اک قافیہ شرار
اس کے سُموں سے طفلکِ آفاق کو بخار

اس کی رگوں میں اپنے اب و جد کا اضطرار
اک ریس میں تو ہار گئی اس سے فورڈ کار

○

ایک اور رنگ سخن:

برسوں حقیقتِ غمِ دوراں کے باوجود
آتی رہی شعور سے چھن کر صدائے دل
طرار و تیز و نازک و کم عمر و کج کلاہ
اک حورِ شوخ و شنگ تھی فرمانروائے دل
ہم مطمئن رہے کہ چلو رات کٹ گئی
اک ٹوٹتی کرن نے پکارا کہ ہائے دل

افراد کا خیال کہاں انقلاب کو
اک تیغِ تیز سی ادھر آئی ادھر گئی
ہم جاگتے رہے تو کلی بھی نہیں کھلی
ہم سو گئے تو سر سے قیامت گزر گئی

مشرق سے آفتاب کی پہلی کرن اٹھی
جیسے سہاگ رات کو سو کر دلھن اٹھی
یوں دُور رات صبح کے نرمی سے ہم خطاب
جیسے کسی حسینہ کی الٹی ہوئی نقاب
دریا کی لہر لہر اڈی ہوئی امنگ
جیسے سپردگی میں جھجکتی انکھڑیوں کا رنگ

○

سیاسیات:

یہ اپنا ملک، کون سنائے اب اس کا حال
اس کے خداؤں کی نہیں ملتی کوئی مثال
ان کی وفا شعار نگاہوں میں پانچ سال
ایسے کٹے ہیں جیسے کسی کی شبِ وصال

○

محلّہ ہوشیار

اے ناظرِ بہار ذرا اور غور کر
رنگِ شفق نہیں ہے، کسی کا گلال ہے
ہر شے کی پُشت پر ہے اک حق آفریں دماغ
فطرت وجودِ شاہدِ فطرت پہ دال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
لیکن یہی تو بادلیئر کا خیال ہے

○

طلسم

غُل پڑ گیا ہے محفلِ افراسیاب میں
لو اوڑھ لی عمر نے گلیمِ تخن وری
سب ساحروں کے خوف سے چہرے نڈھال ہیں
کب آئیں گی خدائے لقا کی سواریاں
کب ہو گی اب عنایتِ جمشید و سامری
کیا کیا نہ رن پڑے مگر آساں گزر گئے
چھکے چھڑائے دیتی تھی صاحبقراں کی جنگ
خیمے جلے، پہاڑ گرے، آندھیاں چلیں
شعلوں کی چلیوں نے زبانیں نکال دیں
بدلا کبھی جو دھوم سے ساحر نے اپنا رنگ
دریا میں ایک شیر تھا، جنگل میں دو نہنگ

جب بھی کسی حسینہ نے جھٹکے سیاہ بال
کتنے جوان مر گئے انداز دیکھ کر
کتنے تباہ ہو گئے پشواز دیکھ کر
انجام سوچ کے، آغاز دیکھ کر
خواجہ کو بھی دکھا کے جھلک ساقیِ صاف کی

صرصر نے کتنی بار گرفتار کر لیا
خواجہ کا کیا قصور' اگر سارے اولیاء
اس سمت آنکلتے تو صرصر کو دیکھ کر
اک دوسرے کی آنکھوں میں ناخون مارتے
اک دوسرے کی پشت میں چھریاں اتارتے

لیکن وہ اور بات تھی' یہ اور بات ہے
اب چھوڑ دیں عمر نے روایاتِ سابقہ
اب وہ مدیرِ خاص ہے دو پرچہ جات کا
جن میں چھڑی ہے پہلی اشاعت سے جنگِ عام
وہ دن گئے کہ رعب سے افراسیاب کے
راتیں ڈراؤنی تھیں' تو دن تھے سیاہ فام
کاتب سے لے کے ناشرِ عالی مقام تک
خواجہ نے اس زمانے میں بدلے ہیں لاکھ نام

عیدیں منا رہی ہے بدیع الزماں کی فوج
اعلان ہو رہا ہے کہ اس رات ہر کنیز
خواجہ کے راستے میں بچھائے گی انکھڑیاں
ہم کیوں ملول و خستہ و باچشمِ نم چلیں
آ' اے خیال' ہم بھی ذرا دو قدم چلیں
آ' اے جنوں کہ ہم بھی ——————

○

فرار، شکست، انتقام وغیرہ وغیرہ

(ایک اور فینٹسیزیا)

اچھا ہوا کہ رسم مروت بھی اٹھ گئی
اچھا ہوا کہ آنکھ کا پانی بھی ڈھل گیا
تاروں میں جس خلوص کے نکھرے تھے خدوخال
وہ دن کی تیز دھوپ میں آیا تو جل گیا

اک لمحہ جاوداں نہ اگر ہو سکا تو کیا
ہم کو شکستِ حرفِ تمنا کا غم نہیں
آئینِ سنگباریٔ فطرت کا رنج ہے
شیشوں کے سوگوار مسیحا کا غم نہیں

اب یہ تو ہے کہ قصۂ فرہاد پر ہمیں
وحشت نہ ہو گی، ٹوٹ کے رونا نہ آئے گا
پروائے ننگ و نام رہے گی جو کل نہ تھی
دل کو دیارِ غیر میں کھونا نہ آئے گا

احساس تو رہے گا کہ ہر ایک بات پر
ہم ہی غلط ہیں، سارا زمانہ غلط نہیں
سینہ فگار ہے تو ہمارا قصور ہے
آفاتِ دو جہاں کا نشانہ غلط نہیں

ماضی کے قیس، آج کے ہم دونوں سادہ لوح
اسٹیکل اور فرائڈ کے کردار عام ہیں
یکتائے روزگار نہیں ہم میں ایک بھی
ہم لوگ صرف اپنی نظر میں امام ہیں

ایک قطعہ اس سلسلے میں:

جسے بچا ہے اسے دے آمریت
متاعِ، غم کی ناپیدی نہیں ہے
بہت ہے یوں تو اس کے میکدے میں
برائے مصطفےٰ زیدی نہیں ہے

○

خود رحمی:

کچھ عشق کی اُفتاد تھی، کچھ حُسن کی توصیف
پہلے تو ہر اک نظم میں اک ڈھنگ، تھا اک طور
ہر شاعرِ امروز پہ لازم ہوئی جب فکر
ہم نے بھی کئی ایسے مسائل پہ کیا غور
اس طرزِ تفکر سے ہوا ذہن میں آغاز
شکووں کا اک انبار، شکایات کا اک دور
اس قسم کے شکوے کہ جو جائیں تو کہاں جائیں
انسان تو انسان ہے لندن ہو کہ لاہور
اس قسم کے شکوے کہ جواں تھا ابھی زیدی
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

○

اس قسم کے شکوے کہ:

یونان کی زمین نے ہذیان و کرب میں
اک اندھے دیوتا کو جنم کس لیے دیا؟
جو بادِ تند و دستِ صبا دیکھتا نہیں
انسان دیکھتا ہے خدا دیکھتا نہیں

مری زبان پہ تانبے کا ذائقہ کیوں ہے
مرا ستارہ کدھر جگمگا کے ڈوب گیا؟
نہ جانے سوزِ طبیعت نہیں کہ آہ نہیں

ردائے ابر کے پیچھے نگارِ ماہ نہیں
نہ جانے کیسی ہے اب ارضِ خاک کی صحت
دعا کریں نہ کریں' التجا کریں نہ کریں

اب تک ہمارے ساتھ رفیقانِ جستجو
کچھ موت' کچھ حیات کے ہمراہ آئے تھے
ہم ایسے بدنصیب کہ میخانہ دیکھنے
یاروں کے التفات کے ہمراہ آئے تھے

یوں ہم کہاں' شراب کہاں' لیکن ایک شام
کچھ یار دوست ساتھ تھے کچھ ہم اداس تھے
اُس کی نظر کے فیض سے غم اور بڑھ گیا
پہلے بھی تھے اداس' مگر کم اداس تھے

○

اس اداس کمرے میں
رات کیسے گزرے گی
نیند کیسے آئے گی
اے جلیس' اے ہمدم
آج میری پلکوں پر
تیری انگلیوں کا لوچ
سسکیاں سی بھرتا ہے
سو چکی ہے کلیوں پر
تیرے ہونٹ کی شبنم
اے جلیس' اے ہمدم
تیرا غم نہ اپنا غم
اس اداس کمرے میں
رات کیسے گزرے گی
نیند کیسے آئے گی

اندھیرے کی سنسان لہروں کے پیچھے
ذرا سا جزیرہ
ذرا سے جزیرے میں دو چار سائے
دھندلکے کی صورت
اندھیرے کی مورت
جو حسرت کو سمجھے نہ خوابوں میں جائے
دھوئیں اور مٹی میں مکڑی کے جالے
یہ "روحیں" یہ "گھر" یہ "محل" یہ شوالے
کوئی اپنے کاندھوں پہ کیا کچھ سنبھالے

وہ آگہی کہ زلف نہ زنجیر دیکھیے
وہ معرفت کہ کون و مکاں گرد رہگزار
وہ منزل گداز کہ حرف سکوت بار
وہ روشنی کہ دوست کی تصویر دیکھیے

○

کراہتے ہوئے دل

میں اسپتال کے بستر پہ تم سے اتنی دور
یہ سوچتا ہوں کہ اتنی عجیب دنیا میں
نہ جانے آج کے دن کیا نہیں ہوا ہو گا
کسی نے بڑھ کے ستارے قفس کیے ہوں گے
کسی کے ہات میں مہتاب آگیا ہوگا
جلائی ہوں گی کسی کے نفس نے قندیلیں
کسی کی بزم میں خورشید ناچتا ہو گا
تمہاری پھول سی فطرت کی شمع نرم سے دور
پہاڑ ہوں گے، سمندر کا راستہ ہو گا

مگر مجھے یہی الجھن کہ زندگی کی یہ بھیک
جو مل گئی بھی تو کتنی ذرا سی بات ملی
کسی کے ہات میں مہتاب آگیا بھی تو کیا
کسی کے قدموں میں سورج کا سر جھکا بھی تو کیا
ہوا ہی کیا جو یہ چھوٹی سی کائنات ملی؟
مرے وجود کی گھری، خموش ویرانی
تمہیں یہاں کے اندھیرے کا علم کیا ہو گا
تمہیں تو صرف مقدر سے چاند رات ملی

○

ویلز کی گاڑی

دن بھر کے سورج کی ہمت ٹوٹ چکی تھی
ویلز کو جانے والی گاڑی چھوٹ چکی تھی
یہ احساس تھا جیسے دل آباد نہیں ہے
کون سا اسٹیشن تھا، بالکل یاد نہیں ہے
یوں بے رنگ تھے جیسے دشت میں گذریں برسوں
ہم ہونے کو کیسا نوواں ہوں یا کچھ ہوں

تھوڑی دیر میں جب سہ پہر کی گاڑی آئی
ہم نے اپنا کوٹ سنبھالا، فلٹ اٹھائی
لیکن ریل میں داخل ہوتے ہی لہرائے
جیسے جسم کو بھولے سے بجلی چھو جائے
وہ سنگیت تھی یا تارا تھی یا نسریں تھی
ایسی شکل تو سارے لندن میں بھی نہیں تھی
دو گھنٹوں میں دوست بنے ہم، پیار جتایا
یہ قصّہ تو خیر کسی فرصت پہ اٹھایا
لیکن اتنا یاد ہے جب سورج نے جگایا
وہ بھی نہیں تھی اپنا اسٹیشن بھی نہیں تھا
جانی پہچانی چیزیں تھیں، خاموشی تھی
ویلز کی گاڑی ویلز سے واپس آ پہنچی تھی

گریہ تو اکثر رہا، پیہم رہا
پھر بھی دل کے بوجھ سے کچھ کم رہا
قمقمے جلتے رہے، بجھتے رہے
رات بھر سینے میں اک عالم رہا
اس وفا دشمن سے چھٹ جانے کے بعد
خود کو پالینے کا کتنا غم رہا
اپنی حالت پر ہنسی بھی آئی تھی
اس ہنسی کا بھی بڑا ماتم رہا
اتنے ربط، اتنی شناسائی کے بعد
کون کس کے حال کا محرم رہا
پتھروں سے بھی نکل آیا جو تیر
وہ مرے پہلو میں آکر جم رہا
ذہن نے کیا کچھ نہ کوشش کی مگر
دل کی گہرائی میں اک آدم رہا

○

کسی تو کام زمانے کے سوگوار آئے
تجھے جو پا نہ سکے زیست کو سنوار آئے
تھا جس پہ وعدۂ فردوس و عاقبت کا مدار
وہ رات ہم سر کوئے بتاں گزار آئے
متاع دل ہی بچی تھی بس اِک زمانے سے
سو ہم اسے بھی تری انجمن میں ہار آئے
بڑے خلوص سے احوال پوچھنے کے لیے
گزر گئی شب فرقت تو میرے یار آئے

○

یہ ایک بات کہ اُس بت کی ہمسری بھی نہیں
مبالغہ بھی نہیں، محض شاعری بھی نہیں

ہم عاشقوں میں جو اک رسم ہے مروت کی
تمہارے شہر میں از رہِ دلبری بھی نہیں
یہاں ہم اپنی تمنا کے زخم کیا بیچیں؟
یہاں تو کوئی ستاروں کا جوہری بھی نہیں
کسی کا قرب جو ملتا تو شعر کیوں کہتے
فسردہ حالیٔ ارباب فن بری بھی نہیں

○

جو دن گزر گئے ہیں ترے التفات میں
میں ان کو جوڑ لوں کہ گھٹا دوں حیات میں؟
کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی مرے واقعات میں
میرا تو جرم تذکرۂ عام ہے مگر
کچھ دھجیاں ہیں میری زلیخا کے ہات میں
آخر تمام عمر کی وسعت سما گئی
اک لمحۂ گزشتہ کی چھوٹی سی بات میں
اے دل ذرا سی جرأت رندی سے کام لے
کتنے چراغ ٹوٹ گئے احتیاط میں

○

کسی اور غم میں اتنی خلشِ نہاں نہیں ہے
غمِ دل مرے رفیقو، غمِ رائگاں نہیں ہے
کوئی ہم نفس نہیں ہے، کوئی رازداں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو وہ مہرباں نہیں ہے
مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسم مرا ترجماں نہیں ہے
کسی آنکھ کو صدا دو، کسی زلف کو پکارو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

○

ہر طرف انبساط ہے اے دل
اور ترے گھر میں رات ہے اے دل
عشق ان ظالموں کی دنیا میں
کتنی مظلوم ذات ہے اے دل
میری حالت کا پوچھنا ہی کیا
سب ترا التفات ہے اے دل
اس طرح آنسوؤں کو ضائع نہ کر
آنسوؤں میں حیات ہے اے دل
اور بیدار چل کہ یہ دنیا
شاطروں کی بساط ہے اے دل
صرف اس نے نہیں دیا مجھے سوز
اس میں تیرا بھی ہات ہے اے دل
مندمل ہو نہ جائے زخمِ دروں
یہ مری کائنات ہے اے دل
حسن کا ایک وار سہ نہ سکا
ڈوب مرنے کی بات ہے اے دل

○

تم ہنسو تو دن نکلے، چپ رہو تو راتیں ہیں
کس کا غم کہاں کا غم، سب فضول باتیں ہیں
اے خلوص میں تجھ کو کس طرح بچاؤں گا
دشمنوں کی چالیں ہیں، ساتھیوں کی گھاتیں ہیں
تم پہ ہی نہیں موقوف، آج کل تو دنیا میں
زیست کے بھی مذہب ہیں، موت کی بھی ذاتیں ہیں

○

سن اے حکیم ملت و پیغمبر نجات
میرے دیار قلب میں کعبہ نہ سومنات
اک پیشہ عشق تھا سو عوض مانگ مانگ کر
رسوا اسے بھی کر گئی سوداگروں کی ذات
ڈرتا ہوں یوں کہ بیچ ہی نکلتے ہیں بیش تر
اس کاروبار شوق میں دل کے توہمات
تیرے غموں سے ایک بڑا فائدہ ہوا
ہم نے سمیٹ لی دل مضطر میں کائنات
اس راہ شوق میں مرے ناتجربہ شناس
غیروں سے ڈر نہ ڈر مگر اپنوں سے احتیاط

○

عشق بتاں اس فکر معاش پہ اپنا رنگ جماتا کیا
ہم نے مانا کعبہ دل میں رہتا پہ کھاتا کیا
پہلی بار کے عشق میں ایسا دیوانہ پن ممکن ہے
روز کی اس شوریدہ سری پہ کوئی ہمیں سمجھاتا کیا
دو دن کی یہ محفل ساقی' رندوں سے ہنس بول کے کاٹ
ہم پھر اپنی راہ لگیں گے تیرا ہمارا ناتا کیا
یوں تو تم سے اپنی انا میں ہم نے کہا کیا کچھ لیکن
تم جاتے تو کیا رہ جاتا' ہم جاتے تو جاتا کیا
ان سے سیدھے منہ ملیے تو ان کے دماغ نہیں ملتے
سب کو دیکھ لیا ہے یارو' داتا کیا ان داتا کیا
سیدھی سادی عقل ہمیشہ مار ہی کھاتی آئی ہے
ہم بھی پیری مریدی کرتے' تو ہم سے اتراتا کیا

○

نگر نگر میلے کو گئے کون سنے گا تیری پکار
اے دل اے دیوانے دل دیواروں سے سر دے مار
روح کے اس ویرانے میں تیری یاد ہی سب کچھ تھی
آج تو وہ بھی یوں گزری جیسے غریبوں کا تیوہار
اس کے وار پہ شاید آج تجھ کو یاد آئے ہوں وہ دن
اے نادان خلوص کہ جب وہ غافل تھا ہم ہشیار
پل پل صدیاں بیت گئیں جانے کس دن بدلے گی
ایک تری آہستہ روی' ایک زمانے کی رفتار
پچھلی فصل میں جتنے بھی اہل جنوں تھے کام آئے
کون سجائے گا تیری مقتل کا ساماں اب کی بار؟
صبح کے نکلے دیوانے اب کیا لوٹ کے آئیں گے
ڈوب چلا ہے شہر میں دن' پھیل چلا ہے سایہ دار

○

۴

انتخاب : موج مری صدف صدف

مطبوعۃ لاہور اکیڈمی، لاہور (پاکستان) طبع اول : جنوری ۱۹۶۰ء

دیباچہ بعنوانہٗ "تجھے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں" از مصطفےٰ زیدی

کتاب کا انتساب : مجتبیٰ زیدی کے نام ——

کتاب کا سرورق : عبد الرحمٰن چغتائی

ایک سہرا

یارو شہیدِ رسمِ جفا ہم ہوئے کہ تم
اپنی سلامتی سے خفا ہم ہوئے کہ تم

ہم پر ہنسے گا جو بھی سنے گا یہ واردات
رسوا سرِ سموم و صبا ہم ہوئے کہ تم

اس کے حریمِ عارض و لب کے سکوت میں
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہم ہوئے کہ تم

مانا کہ وہ ہمارے مقدر سے دور ہے
اس کے لئے دعا ہی دعا ہم ہوئے کہ تم

مانا کہ ہم پہ اس کی محبت حرام ہے
چپ چاپ کشتگانِ وفا ہم ہوئے کہ تم

ہم اس ہوا کو چوم رہے ہیں جہاں وہ تھی
بیعت کنانِ دستِ صبا ہم ہوئے کہ تم

مشرق کے ہر رواج کی قربان گاہ کے
ہمراہیانِ کل شہدا ہم ہوئے کہ تم

ہے اسکے چشم و رخ کی ضیا غیر کے لیے
ہاں اسکے چشم و رخ کی حیا ہم ہوئے کہ تم

ان انکھڑیوں میں شرم کے ڈورے کہاں سے آئے
ان انگلیوں پہ رنگ حنا ہم ہوئے کہ تم

نظروں سے دور جس کو بسانی ہیں بستیاں
اس کے غریب' شہر سبا ہم ہوئے کہ تم

لکھا ہو جس کے سارے ستاروں نے جسکا نام
اس کہکشاں پہ آبلہ پا ہم ہوئے کہ تم

جس کی خموشیوں میں حکایت کا لوچ تھا
اس کی حکایتوں کی بنا ہم ہوئے کہ تم

اس ایک دن میں کتنی ہی صدیاں گذر گئیں
اس ایک پل میں اپنی قضا ہم ہوئے کہ تم

اس عقل و فہم و عمر و فراست کے باوجود
ذہن رقیب و دست گدا ہم ہوئے کہ تم

○

گواہی

(۱)

خدا کی قسم
جو کہوں گا فقط سچ کہوں گا
کٹہرے کے پیچھے یہ انسان دراصل اک بھیڑیا ہے
بہت ہم نے اس کو بچایا' حقیقت کا رستہ دکھایا
ہر اک رنگ سے راستی پر بلایا
مگر یہ نہ آیا
یہاں تک کہ اک روز جب رات دن سے گلے مل رہی تھی
(ہوا چل رہی تھی' کلی کھل رہی تھی)
میں اک چیخ سن کر کنوئیں پر جو پہنچا تو دیکھا
کہ یہ بھیڑیا ایک کمسن کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کی آبرو کا لہو کر رہا ہے

(۲)

خدا کی قسم
جو کہوں گا فقط سچ کہوں گا
کٹہرے کے پیچھے یہ انسان دراصل اک دیوتا ہے
جو نیلی گپھاؤں سے اُودے افق سے' ہمارے لئے رہنما بن کے آیا
ہمیں اس نے چلنا' ابھرنا' بھٹک کر سنبھلنا سکھایا
مگر اس کے ہمسائے کی آمرانہ رعونت کو یہ سب نہ بھایا
اور اک شام جب یہ مرے ساتھ اک کھیت میں چل رہا تھا
یہ ہمسایہ اپنے کئی نوکروں اور غلاموں کو ہمراہ لایا
زدوکوب کی' ایک جھوٹا مقدمہ بنایا
قیامت تو یہ ہے کہ اک نے پی ہے اور دوسرا ہاؤ ہو کر رہا ہے!

○

۵

انتخاب : گریبان

مطبوعہ: لاہور اکیڈمی، لاہور (پاکستان) طبع اول: ۱۹۴۳ء

ابتداء لوئی میک نیس کی ایک نظم سے ———

کتاب کا سرورق : عبدالرحمٰن چغتائی

○

مت پوچھ کہ ہم ضبط کی کس راہ سے گزرے
یہ دیکھ کہ تجھ پہ کوئی الزام نہ آیا

چلے' تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ
ہم اس کے پاس جاتے ہیں' مگر آہستہ آہستہ

ابھی تاروں سے کھیلو' چاند کی کرنوں سے اٹھلاؤ
ملے گی' اس کے چہرے کی سحر آہستہ آہستہ

دریچوں کو تو دیکھو' چلمنوں کے راز تو سمجھو
اٹھیں گے پردہ ہائے بام و در آہستہ آہستہ

زمانے بھر کی کیفیت سمٹ آئے گی ساغر میں
پیو ان انکھڑیوں کے نام پر آہستہ آہستہ

یونہی اک روز اپنے دل کا قصہ بھی سنا دینا
خطاب آہستہ آہستہ' نظر آہستہ آہستہ

○

حرف ہے شیشہ، ہونٹ ہیں ساغر، لفظ ہے جام
تیرا نام زبان پہ آیا تیرا نام

شیخ سے کم رتبہ ہے مے خانے کا امام
مسلکِ دنیا یہ ہے، تو اس مسلک کو سلام

دنیا داری نے دیں دار بنا ڈالا
اس سے تو یہ اچھا تھا کہ ہو جاتے بدنام

آنے والے دن کا استقبال کرو
گزری شام سے کیا لینا ہے، گزری شام

تم نے نفیری اور کہیں پہ سنی ہو گی
اس نگری میں یا سناٹا یا کہرام

شہرِ وفا خالی کر جائیں، اے دلِ زار
سب مر جائیں، رگھپتی راگھو راجا رام

○

اب جی حدودِ سود و زیاں سے گزر گیا
اچھا وہی رہا، جو جوانی میں مر گیا

پلکوں پہ آ کے رک سی گئی تھی ہر ایک موج
کل رو لیے، تو آنکھ سے دریا اتر گیا

آخر، بہار کو تو جو کرنا تھا، کر گئی
الزام احتیاطِ گریباں کے سر گیا

زنجیر ماتمی ہے، تم اے عقلانِ شہر
اب کس کو پوچھتے ہو، دوانہ تو مر گیا

بہتان

کیا یہی ہونٹ ہیں' جو مرے واسطے
انگبیں تھے' مئے ناب تھے' آگ تھے

کیا یہی جسم ہے' جس کے سب زاوئے
میرے آغوش میں راگ ہی راگ تھے

ہاں بڑی چیز ہے راہ و رسمِ جہاں
دوست' خاوند' بہنیں' قفس' پاسباں

ننگ و ناموس—سینے کی چنگاریاں
وہ ترا امتحاں—یہ مرا امتحاں

رکھ لیا اپنے رشتوں کا تو نے بھرم
آبگینہ تھا دل' اس کو بھی سہہ گیا

تو مجھے "بھائی" کہتی رہی اور میں
کیا بتاؤں' تجھے دیکھتا رہ گیا

○

چراغاں

تری راہ پر ہم نے کلیاں بکھیری تھیں' تارے سجائے تھے' کیا کچھ کیا تھا
جو برسوں سے چاک و دریدہ چلا آ رہا تھا' وہ اپنا گریباں سیا تھا
نئے پھول مالی سے منگوائے تھے' بام و در پر نیا رنگ و روغن کیا تھا
کتابیں سلیقے سے رکھ دی تھیں' بوتل ہٹا دی تھی گھر میں چراغاں کیا تھا
اگر علم ہوتا کہ تو آج کی شب نہ آئے گی' تو حسب معمول رہتے
ترے غم کی مدھم سی آتش میں جلتے' مگر تجھ سے دل کی حکایت نہ کہتے
نہ کہتے کہ اب ایک اک رگ سے' اک ایک موئے بدن سے دھواں اٹھ رہا ہے
جو ٹھیرا تھا اپنی خودی کی سرائے میں' وہ ضبط کا کارواں اٹھ رہا ہے

تجھے آج تک خط نہ لکھا تھا اور آج بھی یہ نہ لکھتے کہ ہم مر رہے ہیں
نگاہوں سے سب کچھ بتاتے' اشارے سے کہتے کہ دل کو لہو کر رہے ہیں

مگر تیری غفلت نے (شاید ترے شیوہ امتحاں نے)

یہ منزل دکھا دی
کہ تھم تھم کے آنسو نکلتے تھے پہلے، مگر آج تو
دل کی ندی چڑھا دی

اٹھے تھے کہ جشنِ چراغاں منائیں، مگر دل کے
سارے دیے سو گئے ہیں
چلے تھے کہ دنیا کو رستہ دکھائیں اور اب
جیسے جنگل میں خود کھو گئے ہیں

○

ننگ و نام

صبح تک آتی ہے سینے سے کسی کی آواز
ہائے، یہ سلسلۂ شامِ غریباں، زیدی

تو مرے واسطے کیوں موردِ الزام ہوا
تو نے کیوں ترک کیا رشتۂ یاراں، زیدی

اب نہ وہ کوچہ و بازار میں آنا جانا
اب نہ وہ صحبتِ اصحاب و ادیباں، زیدی

اب ترے غم پہ زمانے کو ہنسی آتی ہے
پھول ملتا ہے تو کھلتا ہے گلستاں، زیدی

تیرے نزدیک سے کترا کے نکل جاتے ہیں
تیرے ایوانِ ادب و فکر کے درباں، زیدی

لشکر و افسر و اورنگ مٹا کر تو نے
وضع کی صورتِ مستورِ فقیراں، زیدی

آج اک گوشۂ گمنام میں افتادہ ہے
کل ترے نام سے تھا نامِ نگاراں، زیدی

تیرے وجدان کا خورشید کہاں ڈوب گیا
کیا ہوا فلسفۂ عصمتِ عصیاں، زیدی

ہائے تو راکھ کی مانند بجھا بیٹھا ہے
شعلۂ رخ، شعلۂ صفت، شعلۂ خرماں، زیدی

میں ترے نام کی لو' میں ترا روشن آغوش
میرے رسوا' مرے حیراں' مرے ویراں' زیدی

میں نے یوں اپنے سلاسل کی نہیں کی پروا
ٹوٹ جائے نہ کہیں سلسلۂ جاں' زیدی

اس لئے آئی ہوں ناموس سے غافل ہو کر
تو نہ ہو جائے کہیں چاک گریباں' زیدی

کیسے سینے کی اس آواز کو سمجھاؤں میں
میرے سینے میں مزا میر نہ الحاں' زیدی

وہ مجسم کوئی آیت' کوئی نور افلاک
میں پراگندہ نہ ملحد' نہ مسلماں' زیدی

آگ کے سامنے جس طرح کوئی موم کا بت
دھوپ میں جیسے ظلمات کی پریاں' زیدی

ایک ننھی سی کرن اور اڈتے بادل
ایک چھوٹی سی کلی اور بیاباں' زیدی

میں تو بس ایک دیا تھا' سو کہیں جل بجھتا
اس نے کیوں چھوڑ دیا جشنِ چراغاں زیدی

○

کہانی

بچو، ہم پہ ہنسنے والو، آؤ، تمہیں سمجھائیں
جس کے لئے اس حال کو پہنچے، اس کا نام بتائیں

روپ نگر کی اک رانی تھی، اس سے ہوا لگاؤ
بچو، اس رانی کی کہانی سن لو اور سو جاؤ

اس پر مرنا، آہیں بھرنا، رونا، کڑھنا، جلنا
آب و ہوا پر زندہ رہنا، انگاروں پہ چلنا

ہم جنگل جنگل پھرتے تھے اس کے لئے دیوانے
رشی بنے، مجنوں کہلائے، لیکن ہار نہ مانے

برسوں کیا کیا چنے چبائے، کیا کیا پاپڑ بیلے
لہروں کو ہمراز بنایا، طوفانوں سے کھیلے

دفتر بھولے، بستر بھولے، پینے لگے شراب
پل بھر آنکھ لگے، تو آئیں الٹے سیدھے خواب

نیند میں کیا کیا دیکھیں، تڑپیں، روئیں، اٹھ اٹھ جائیں،
سو جانے کی گولی کھائیں، انجکشن لگوائیں

آخر وہ اک خواب میں آئی سن کے ہمارا حال
کوئل جیسی بات تھی اس کی، ہرنی جیسی چال

کہنے لگی: کوی جی، تیرا حال نہ دیکھا جائے
میں نے کہا کہ رانی اپنی پرجا کو بہلائے

کہنے لگی کہ تو کیا لے گا، سونا، چاندی، ہار
میں نے کہا کہ رانی، تیرے مکھڑے کی تلوار

پھر دل کے آنگن میں اُترا اس کا سارا روپ
اس چہرے کی جھلمل کرنیں، اس مکھڑے کی دھوپ

دھوپ پڑی، تو کھل گئی آنکھیں کھل گیا سارا بھید
غش کھایا، تو دوڑے آئے شفی، پنڈت، وید

وہ دن ہے اور آج کا دن ہے چھُٹ گیا کھانا پانی
چھٹ گیا کھانا پانی بچو، ہو گئی ختم کہانی

میری کہانی میں لیکن اک بھید ہے، اس کو پاؤ
چاند کو دور ہی دور سے دیکھو، چاند کے پاس نہ جاؤ

نہ اپنے گھر ہی اس کو بلاؤ

○

۲

انتخاب : قبائے ساز

مطبوعہ: جوش اکیڈمی، لاہور (پاکستان) طبع اول: ۱۹۷۷ء

کتاب کا سرورق : عبدالرحمٰن چغتائی

جب ہوا شب کو بدلی ہوئی پہلو آئی
مدتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی

دن کی اک اک بوند گراں ہے، اک اک جرعۂ شب نایاب
شام و سحر کے پیمانے میں جو کچھ ہے، ذرہ ذرہ کے پیو

آہستہ آہستہ برتو ان گنتی کی سانسوں کو
دل کے ہات میں شیشۂ جاں ہے، قطرہ قطرہ کر کے پیو

○

درد دل بھی غم دوراں کے برابر سے اٹھا
آگ صحرا میں لگی اور دھواں گھر سے اٹھا

تابش حسن بھی تھی، آتش دنیا بھی، مگر
شعلہ جس نے مجھے پھونکا مرے اندر سے اٹھا

کسی موسم کی فقیروں کو ضرورت نہ رہی
آگ بھی، ابر بھی، طوفان بھی ساغر سے اٹھا

بے صدف کتنے ہی دریاؤں سے کچھ بھی نہ ہوا
بوجھ قطرے کا تھا ایسا کہ سمندر سے اٹھا

چاند سے شکوہ بلب ہوں کہ سلایا کیوں تھا
میں کہ خورشید جہانتاب کی ٹھوکر سے اٹھا

○

حال احوال

ایک اکیلے ہم ایسے جو آدھی رات ڈھلے
چھوڑ کے کاہکشاں کا رستہ انگاروں پہ چلے

سچائی کی منزل جگمگ جگمگ کرتی ہے
لیکن اس تک کیسے پہنچیں راہ میں آگ جلے

عہدوں کے وہ پودے آئے کچھ لوگوں کے ہات
صبح کو جن کا بیج لگے اور شام کے وقت پھلے

کیسے کیسے سنگھاسن لے کر بیٹھ گئے عیار
ملا، پنڈت، ڈاکو، افسر، ایک سے ایک بھلے

کوئی خرد کی محفل میں اقوال و کمال بتائے
کوئی بزم جمال سجائے جام پہ جام ڈھلے

○

نئی آبادی

سنبھل سنبھل کے چلے دوستانِ عہدِ طرب
کوئی قدیم رفاقت گلے نہ پڑ جائے
ستم زدوں کی محبت گلے نہ پڑ جائے
کہیں پکار نہ لے درد کی کوئی چلمن
کہیں خلوص کے شعلے پکڑ نہ لیں دامن
اتر نہ جائے رخِ دست گیر کا غازہ
لپٹ نہ جائے قدم سے وفا کا دروازہ
دیارِ غم کی صداقت گلے نہ پڑ جائے

ادھر ستائے ہوئے دل نظر بچا کے چلے
ضمیر سنگ میں شیشے کی آبرو کیا تھی
کھلے تھے زخم ستاروں کی جستجو کیا تھی
جھکی ہوئی تھیں نگاہیں تھمے ہوئے تھے قدم
سلی ہوئی تھیں زبانیں جلے ہوئے تھے علم
وہ خامشی کہ سراغِ صدا نہ مل جائے
وہ احتیاط کہ دردِ آشنا نہ مل جائے
دعا کو ہات نہ اٹھیں پتہ نہ مل جائے

غرض کسی کو کسی سے کوئی گلہ نہ ہوا
مہاجروں کے محلے میں حادثہ نہ ہوا

○

ڈھلے گی رات آئے گی سحر آہستہ آہستہ
پیو ان انکھڑیوں کے نام پر آہستہ آہستہ

دکھا دینا اسے زخمِ جگر آہستہ آہستہ
سمجھ کر، سوچ کر پہچان کر آہستہ آہستہ

اٹھا دینا حجابِ رسمیاتِ درمیاں لیکن
خطاب آہستہ آہستہ نظر آہستہ آہستہ

دریچوں کو تو دیکھو چلمنوں کے راز تو سمجھو
اٹھیں گے پردہ ہائے بام و در آہستہ آہستہ

ابھی تاروں سے کھیلو چاندنی سے دل کو بہلاؤ
ملے گی اس کے چہرے کی سحر آہستہ آہستہ

کہیں شامِ بلا ہو گی کہیں صبحِ کماں داراں
کٹے گا زلف و مژگاں کا سفر آہستہ آہستہ

یکایک ایسے جل بجھنے میں لطفِ جاں کنی کب تھا
جلے اک شمع پر ہم بھی مگر آہستہ آہستہ

○

آندھی چلی تو نقشِ کفِ پا نہیں ملا
دل جس سے مل گیا وہ دوبارا نہیں ملا
ہم انجمن میں سب کی طرف دیکھتے رہے
اپنی طرح سے کوئی اکیلا نہیں ملا
قدموں کو شوقِ آبلہ پائی تو مل گیا
لیکن بہ ظرفِ وسعتِ صحرا نہیں ملا
کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی
مضبوط کشتیوں کو کنارا نہیں ملا

○

بجھ گئی شمعِ حرم، بابِ کلیسا نہ کھلا
کھل گئے زخم کے لب تیرا دریچہ نہ کھلا
درِ توبہ سے بگولوں کی طرح گذرے لوگ
ابر کی طرح امڈ آئے جو مے خانہ کھلا
شہر در شہر پھری میرے گناہوں کی بیاض
بعض نظروں پہ مرا سوزِ حکیمانہ کھلا
مل کے بھی تجھ سے رہی اب کے طبیعت ایسے
جیسے بادل سا گھر آیا جو نہ برسا نہ کھلا
ایک اک شکل کو دیکھا ہے بڑی حیرت سے
اجنبی کون ہے اور کون شناسا نہ کھلا

○

○

سارى محفلِ لطف بیاں پہ جھوم رہی ہے
دل میں ہے جو شہرِ خموشاں کس سے کہیے

ساعتِ گل کے دیکھنے والے آئے ہوئے ہیں
شبنم تیرا گریۂ پنہاں کس سے کہیے

شام سے زخموں کی دوکان سجائی ہوئی ہے
اپنا یہ اندازِ چراغاں کس سے کہیے

اوجِ فضا پہ تیز ہوا کا دم گھٹتا ہے
وسعتِ تنگیٔ زنداں کس سے کہیے

○

دیوانوں پہ کیا گذری

صرف دو چار برس قبل یونہیں برسرِ راہ
مل گیا ہوتا اگر کوئی اشارا ہم کو
کسی خاموش تکلم کا سہارا ہم کو
یہی دزدیدہ تبسم، یہی چہرے کی پکار
یہی وعدہ، یہی ایماء، یہی مبہم اقرار

ہم اسے عرش کی سرحد سے ملانے چلتے
پھول کہتے کبھی نغمیت بنانے چلتے
خانقاہوں کی طرف دیپ جلانے چلتے

صرف دو چار برس قبل، مگر اب یہ ہے
کہ تری نرم نگاہی کا اشارا پا کر
کبھی بستر کبھی کمرے کا خیال آتا ہے

زندگی جسم کی خواہش کے سوا کچھ بھی نہیں
خون میں خون کی گردش کے سوا کچھ بھی نہیں

○

فرار

اس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے

رقص تھم جائے، اداؤں کے خزانے لٹ جائیں
وقت کا درد، نگاہوں کی تھکن، ذہن کا بوجھ
نغمہ و ساغر و الہام کا رتبہ پا لے
کونپلیں دھوپ سے اک قطرہ شبنم مانگیں
سنگساری کا سزا وار ہو بلور کا جسم
دل کے اجڑے ہوئے مندر میں وفا کی مشعل
مصلحت کیش طوفان کی زد میں آجائے
آہوئے دشت، جنوں شہر کی حد میں آجائے

سب کے قدموں میں تمنا پہ خمیازہ گرے

عاقلو، دیدہ ورو، دوسری راہیں ڈھونڈو
اس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے

○

۷

انتخاب : کوہ ندا

مطبوعہ: کتب پرنٹرز و پبلشرز لمیٹڈ کراچی (پاکستان) طبع اول ۱۹۷۱ء

مصطفےٰ زیدی: ایک تعارف (ادارہ)
حرف آخر: از مصطفےٰ زیدی
شام غزل: از مصطفےٰ زیدی
کتاب کا سرورق : مصطفےٰ زیدی

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

آخری بار ملو

آخری بار ملو ایسے کہ جلتے ہوئے دل
راکھ ہو جائیں، کوئی اور تقاضہ نہ کریں
چاکِ وعدہ نہ سلے، زخم تمنا نہ کھلے
سانس ہموار رہے، شمع کی لو تک نہ ہلے
باتیں بس اتنی کہ لمحے انہیں آکر گن جائیں
آنکھ اٹھائے کوئی امید تو آنکھیں چھن جائیں

اس ملاقات کا اس بار کوئی وہم نہیں
جس سے اک اور ملاقات کی صورت نکلے
اب نہ ہیجان و جنوں کا نہ حکایات کا وقت
اب نہ تجدیدِ وفا کا نہ شکایات کا وقت

لٹ گئی شہرِ حوادث میں متاعِ الفاظ
اب جو کہنا ہے تو کیسے کوئی نوحہ کہیے
آج تک تم سے رگِ جاں کے کئی رشتے تھے
کل سے جو ہو گا اسے کون سا رشتہ کہیے

پھر نہ دہکیں گے کبھی عارض و رخسار، ملو
ماتمی ہیں دمِ رخصت در و دیوار، ملو
پھر نہ ہم ہوں گے، نہ اقرار، نہ انکار، ملو
آخری بار ملو

فگار پاؤں مرے

فگار پاؤں مرے، اشک نارسا میرے
کہیں تو مل مجھے اے گم شدہ خدا میرے

میں شمعِ کشتہ بھی تھا، صبح کی نوید بھی تھا
شکست میں کوئی انداز دیکھنا میرے

وہ دردِ دل میں ملا، سوزِ جسم و جاں میں ملا
کہاں کہاں اسے ڈھونڈا جو ساتھ تھا میرے

ہر اک کے شعر میں میں اس کا عکس دیکھتا ہوں
مری زباں سے جو اشعار لے گیا میرے

سفر بھی میں تھا، مسافر بھی میں تھا، راہ بھی میں
کوئی نہیں تھا کڑے کوس ماسوا میرے

وفا کا نام بھی زندہ ہے، میں بھی زندہ ہوں
اب اپنا حال سنا مجھ کو بے وفا میرے

○

کس وقت اجالا پھیلے گا

کس وقت اجالا پھیلے گا، اے صبح و مساکی تیرہ شبی
کب آئے گا دورِ ساغرِ دل، اے کوثرِ جاں کی تشنہ لبی

سب سنگ بہ جیب تھے، سر ہی نہ تھا، زخموں کا کوئی خوگر ہی نہ تھا
ہر شخص میں تھی درماں طلبی، کیا کج کلہی، کیا کم لقبی

ہم بات کریں تو کس سے کریں، بنیاد رکھیں تو کس پہ رکھیں
اے اہلِ ہنر کے عجزِ سخن، اے زندگیوں کی بے سببی

سنسان پڑی ہیں برسوں سے سب رشد و ہدایت کی راہیں
اس عہد میں ہم سب اپنے امام، اس دور میں ہم سب اپنے نبی

میں سنگیوں سے کھیلا ہوں، مٹی کی تہوں سے لایا ہوں
تہذیب کا یہ معیارِ نظر، اخلاق کی یہ عالی نسبی

○

کوہ ندا

ایہا الناس، چلو کوہ ندا کی جانب
کب تک آشفتہ سری ہو گی نئے ناموں سے
تھک چکے ہو گے خرابات کے ہنگاموں سے
ہر طرف ایک ہی انداز سے دن ڈھلتے ہیں
لوگ ہر شہر میں سائے کی طرح چلتے ہیں
اجنبی خوف کو سینوں میں چھپائے ہوئے لوگ
اپنے آسیب کے تابوت اٹھائے ہوئے لوگ
ذات کے کرب میں، بازار کی رسوائی میں
تم بھی شامل ہو اس انبوہ کی تنہائی میں

تم بھی اک بادیہ پیما ہو خلا کی جانب
خود ہی سوچو کہ ہر اک در سے ملا کیا آخر
کارآمد ہوئی فریاد کہ ناکام ہوئی
اپنی گلیوں میں سے کس کس نے ستایا تم کو
دشتِ غربت میں کہاں صبح، کہاں شام ہوئی
کس نے سوئے ہوئے اسبابِ فغاں کو چھیڑا
کس نے دکھتے ہوئے تارِ رگِ جاں کو چھیڑا
کس نے سمجھائیں تمہیں عشرتِ غم کی باتیں

کون لایا تمہیں اندوہ وفا کی جانب
اب کدھر جاؤ گے، کیا اپنا وطن، کیا پردیس
ہر طرف ایک سی سمتوں کا نشاں ملتا ہے
اپنی آواز بکھر جاتی ہے آوازوں میں
اپنا پندار ملول و نگراں ملتا ہے

پھونک کر خود کو نظر آتی ہے احساس کی راکھ
وقت کی آنچ پہ لمحوں کا دھواں ملتا ہے
راستے کھوئے چلے جاتے ہیں سناٹوں میں

مشعلیں خود بخود آتی ہیں ہوا کی جانب
کب تک افسانہ و افسوں کی خشیشی راتیں
طلب جنس و تلاش شب امکاں کب تک
ذہن کو کیسے سنبھالے گی بدن کی دیوار
درد کا بوجھ اٹھائے گا شبستاں کب تک
دیر سے نیند کو ترسی ہوئی آنکھوں کے لیے
خواب اور نشہ عارض و مژگاں کب تک
کتنے دن اور پکارے گی تمھیں جسم کی پیاس

نغمہ و غمزہ و انداز و ادا کی جانب
رات بھر جاگتے رہتے ہیں دکانوں کے چراغ
دل وہ سنسان جزیرہ کہ بجھا رہتا ہے
لیکن اس بند جزیرے کے ہر اک گوشے میں
ذات کا باب طلسمات کھلا رہتا ہے
اپنی ہی ذات میں پستی کے کھنڈر ملتے ہیں
اپنی ہی ذات میں اک کوہ ندا رہتا ہے
صرف اس کوہ کے دامن میں میسر ہے نجات
آدمی ورنہ عناصر میں گھرا رہتا ہے
اور پھر ان سے بھی گھبرا کے اٹھاتا ہے نظر

اپنے مذہب کی طرف، اپنے خدا کی جانب
ایہا الناس، چلو کوہ ندا کی جانب

○

ویٹ نام

کل مرے دوست کی ہنستی ہوئی نیلی آنکھیں
دور سے آئے ہوئے خط کے ہر اندیشے کو

وہم کہتی تھیں، سمجھتی تھیں کہ یہ شکل جسے
اس نے دیکھا ہے ابھی کیمپ کے آئینے میں

مسکراتی ہوئی جب اپنے وطن پہنچے گی
کوئی بھیگی ہوئی پلکوں سے اسے چومے گا

اور شرمندہ نگاہوں سے مسرت کی کرن
ایسے پھوٹے گی کہ پھر رات کا امکاں نہ رہے

اور اب میں ہوں، ہوا میں مرے سگرٹ کا دھواں
نام چٹھی کے نئے ٹکٹ میں کسیلی کافی

اسٹریچر پہ یہ پھیلا ہوا فوجی کمبل
اس کے بے جان بدن کا یہ اکیلا ساتھی

ابھی "رن وے" پہ کوئی قبر نما طیارہ
میرے اس آخری دیدار کو لے جائے گا

سائیگان اپنے ایرپورٹ کے سناٹے میں

مجھ سے پوچھے گا وہی چند سوالات کہ جو
مجھ سے پہلے بھی کسی اور سے پوچھے ہوں گے

○

مری پتھر آنکھیں

اب کے مٹی کی عبارت میں لکھی جائے گی
سبز پتوں کی کہانی، رخِ شاداب کی بات

کل کے دریاؤں کی مٹتی ہوئی مبہم تحریر
اب فقط ریت کے دامن میں نظر آئے گی

بوند بھر نم کو ترس جائے گی بے سود دعا
نم اگر ہو گی کوئی چیز تو میرے آنکھیں

میری پلکوں کے دریچے، مری بنجر آنکھیں
میرا اجڑا ہوا چہرہ، مری پتھر آنکھیں

○

راکھ

پکارتا تھا پر اسرار عالم، موجود
تھکی تھکی ہوئی ارواح، رفتگاں کی طرح
وہ داستاں تھی کسی اور شاہزادے کی
مرا لہو تھا فقط زیب داستاں کی طرح

جدھر جدھر سے بھی گزرا جلوس، رسوائی
کھڑے تھے لوگ دریچوں میں شمع داں کی طرح

لیے ہوئے مرے ناکردہ جرم کی فردیں
ہر ایک دوست ملا مرگ، ناگہاں کی طرح

بوقت، قتل بہت دور میرے سارے عزیز
صف آزما تھے نگہبان آسماں کی طرح

○

کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مدد دے

لٹ گئی دولتِ ایمان و متاعِ عرفاں
کیسہ منبر و محراب و کلیسا مدد دے

آج اولاد پہ ہے قحطِ ضمیر و جرأت
خونِ اجداد رسد! عزتِ آباد مدد دے

میں اکیلا نکل آیا ہوں ستاروں کی طرف
کرۂ ارض کی اے مجلسِ شوریٰ مدد دے

سامری سانپ مری سمت بڑھے آتے ہیں
زورِ اعصائے کلیم و یدِ بیضا مدد دے

لحن و آہنگ کے شہروں میں اتر آیا ہے
اجنبی خوف کا پھیلا ہوا صحرا مدد دے

آج گم گشتۂ منزل ہیں روایاتِ خضر
آج بیمار ہے صدیوں کا مسیحا مدد دے

پیاس ایسی کہ زباں منہ سے نکل آئی ہے
کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مدد دے

برف باری مرے کمرے میں اتر آئی ہے
تابشِ زمزمہ و حدتِ صہبا مدد دے

ایک بزدل مرے سینے میں بڑی دیر سے ہے
جرأتِ خودکشی و قتلِ اعزا مدد دے

میں تو دونوں ہی کی لوری سے بہل جاؤں گا

قربتِ ساحل و گہوارۂ دریا مددے

کوئی آیا ہے مجھے آگ لگانے کے لیے
صحن بے چارگی مسجد اقصیٰ مددے

کس طرف سجدہ کروں کس سے دعائیں مانگوں
اے مرے شش جہتِ قبلہ و کعبہ مددے

حلق اصغر کی طرف ایک کماں اور کھنچی
اے ہواؤں کے رخ اے گردشِ صحرا مددے

اک رسن اور بڑھی سوئے سکینہ ہشیار
اک صلیب اور ہوئی درپے عیسیٰ مددے

ایک اک چہرہ گل رنگ بجھا جاتا ہے
صحتِ جلوۂ آئینۂ فردا مددے

○

اے صبح کے غمخوارو!

اے صبح کے غمخوارو' اس رات سے مت ڈرنا
جس ہات میں خنجر ہے اس ہات سے مت ڈرنا
خورشید کے متوالو' ذرات سے مت ڈرنا
چنگیز نژادوں کی اوقات سے مت ڈرنا

ہاں شامل ِ لب ہو گی نفرت بھی' ملامت بھی
یارانہ کدورت بھی' دیرینہ عداوت بھی
گزرے ہوئے لمحوں کی مرحوم رفاقت بھی
قبروں پہ کھڑے ہو کر جذبات سے مت ڈرنا

آباد ضمیروں کو افتاد ِ ستم کیا ہے
آسودہ ہو جب دل پھر تکلیف شکم کیا ہے
تدبیر ِ فلک کیا ہے' تقدیر امم کیا ہے
محرم ہو تو دو دن کے حالات سے مت ڈرنا

روداد ِ سرِ دامن کب تک نہ عیاں ہو گی
ناکردہ گناہوں کے منہ میں تو زباں ہو گی
جس وقت جرائم کی فہرست بیاں ہو گی
اس وقت عدالت کے اثبات سے مت ڈرنا
اے صبح کے غمخوارو!

○

دیدنی

میری پلکوں کو مت دیکھو
ان کا اٹھنا، ان کا جھپکنا، جسم کا نامحسوس عمل ہے
میری آنکھوں کو مت دیکھو
ان کی اوٹ میں شامِ غریباں، ان کی آڑ میں دشتِ ازل ہے
میرے چہرے کو مت دیکھو
اس میں کوئی وعدۂ فردا، اس میں کوئی آج نہ کل ہے
اب اس دریا تک مت آؤ جس کی لہریں ٹوٹ چکی ہیں
اس سینے سے لو نہ لگاؤ جس کی نبضیں چھوٹ چکی ہیں
اب میرے قاتل کو چاہو
میرا قاتل مرہم مرہم، دریا دریا، ساحل ساحل
قاضیِ شہر کا ماتھا چومو
جس کے قلم میں زہرِ ہلاہل، جس کے سخن میں لحن سلاسل
اب اس رقص کی دھن پر ناچو
جس کی گت پر لٹ گیا قاضی، جس کی لے پر بک گیا قاتل

○

شہناز

(۱)

جو بھی تھا، چاک گریباں کا تماشائی تھا
تو نہ ہوتی تو یہ تدبیر رفو کرتا کون؟
ایک ہی ساغر زہراب بہت کافی تھا
دوسری بار تمنائے سبو کرتا کون؟
تیرے چہرے پہ جو تقدیس نہ ہوتی ایسی
دل کے مواج سمندر میں وضو کرتا کون؟

تو نے اندیشۂ فردا کو سمجھنے پر بھی
میرے امروز کو ہر فکر سے بالا رکھا
لے چلی تھی مجھے ذروں کی طرح باد سموم
اس پہ ممنوع تھا اک بوند کی فیاضی بھی
تو نے جس ہونٹ پہ کوثر کا پیالا رکھا

اپنی پلکوں میں چھپایا مجھے تو نے اس وقت
جب سرراہ ہر اک فرد مرا قاتل تھا
تو نے آکر مجھے جرات کی اکائی بخشی
مجھ میں اک شخص بہادر تھا اور اک بزدل تھا
کوئی واقف ہی نہیں ہے کہ رجز کے ہنگام
میرے لہجے میں ترا گرم لہو شامل تھا

رنگ میں سادہ مزاجی کا بھرم تجھ سے ہے
سنگ میں زحمت تخلیق صنم تجھ سے ہے
تجھ سے ہے، یوں فراواں ہے، وفا کی دولت
یہ جو اندیشۂ جاں اتنا ہے کم، تجھ سے ہے
میں الگ ہو کے لکھوں تیری کہانی کیسے
میرا فن، میرا سخن، میرا قلم تجھ سے ہے

شہناز

(۲)

فن کار خود نہ تھی، مرے فن کی شریک تھی
وہ روح کے سفر میں بدن کی شریک تھی

اترا تھا جس پہ باب حیا کا ورق ورق
بستر کی ایک ایک شکن کی شریک تھی

میں ایک اعتبار سے آتش پرست تھا
وہ سارے زاویوں سے چمن کی شریک تھی

وہ نازشِ ستارہ و طنازِ ماہتاب
گردش کے وقت میرے گہن کی شریک تھی

وہ ہم جلیس سانحہ زحمت نشاط
آسائش صلیب و رسن کی شریک تھی

ناقابل بیان اندھیرے کے باوجود
میری دعائے صبح وطن کی شریک تھی

دنیا میں ایک سال کی مدت کا قرب تھا
دل میں کئی ہزار قرن کی شریک تھی

○

شہناز

(۳)

میرے زخموں سے، مری راکھ سے تصدیق کرو
کہ مسیحا نفس و شعلہ جبیں تھا کوئی

ماسوا وہم جہاں، ذکرِ خدا وہم جہاں
ہاں اسی ذہن میں عرفان و یقیں تھا کوئی

فون خاموش ہے اور گیٹ کی گھنٹی بے صوت
جیسے اس شہر میں رہتا ہی نہیں تھا کوئی

بزم ارواح تھی یا تیرے دہکتے ہوئے ہونٹ
واقعہ تھا کہ گماں تھا کہ یقیں تھا کوئی

میرا اقرار ہے اب اور مری تنہائی ہے
میرے انکار پہ بھی میرا امیں تھا کوئی

شاعرو نغمہ گرو، سنگ تراشو، دیکھو
اس سے مل لو تو بتانا کہ حسیں تھا کوئی

○

شہناز

(۳)

"خود کو تاراج کرو" زندگیاں کم کر لو
جتنا چاہو دلِ شوریدہ کا ماتم کر لو

تابِ وحشت کسی صحرا، کسی زنداں میں نہیں
اس قدر چارہ گری وقت کے امکاں میں نہیں

○

خاطرِ جاں کے قرینے تو کہاں آئیں گے
صرف یہ ہو گا کہ احباب بچھڑ جائیں گے

گھر جو اجڑے تو سنورتے نہیں دیکھے اب تک
ایسے ناسور تو بھرتے نہیں دیکھے اب تک

○

شہناز

(۵)

جس طرح ترکِ تعلق پہ ہے اصرار اب کے
ایسی شدت تو مرے عہدِ وفا میں بھی نہ تھی

میں نے تو دیدہ و دانستہ پیا ہے وہ زہر
جس کی جرأت صفِ تسلیم و رضا میں بھی نہ تھی

تو نے جس لہر کی صورت سے مجھے چاہا تھا
ساز میں بھی نہ تھی وہ بات، صبا میں بھی نہ تھی

بے نیاز ایسا تھا میں وشتِ جنوں میں کھو کر
مجھ کو پانے کی سکت ارض و سما میں بھی نہ تھی

اور اب یوں ہے کہ جیسے کبھی رسمِ اخلاص
ہم نشینوں میں تو کیا، ہم فقرا میں بھی نہ تھی

بے وفائی کی یہ مشترکہ نئی آسائش
دلِ پُرخوں میں بھی اور رنگِ حنا میں بھی نہ تھی

نہ تو شرمندہ ہے دل اور نہ حنا خوار اب کے
جس طرح ترکِ تعلق پہ ہے اصرار اب کے

کتابیات: مصطفےٰ زیدی

قلمی آثار: مطبوعہ شعری مجموعے:

۱۔ "زنجیریں" دیباچہ: رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری
مطبوعہ: سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد (بھارت) طبع اول: جولائی ۱۹۴۷ء
یاد رہے کہ یہ مجموعہ مصطفےٰ زیدی نے ۱۹۴۵ء میں "روحِ عصر" نام سے شائع کرنا چاہا تھا۔ بعد میں "زنجیریں" نام رکھا۔

۲۔ "روشنی" دیباچہ بعنوان: "چراغ آفریدم" از مصطفےٰ زیدی
مطبوعہ: مکتبہ حیات نو، الہ آباد (بھارت) طبع اول: ۱۹۴۹ء
مکتبہ ادب جدید، لاہور (پاکستان) طبع دوم: ۱۹۶۰ء
ماورا پبلشرز راولپنڈی / لاہور (پاکستان) طبع سوم: س۔ن

۳۔ "شہرِ آذر" دیباچہ بعنوان: "اپنا دیواں بغل میں داب کے میر" از مصطفےٰ زیدی
مطبوعہ: لاہور اکیڈمی، لاہور (پاکستان) طبع اول: جنوری ۱۹۵۸ء
ماورا پبلشرز، لاہور (پاکستان)
یہ مجموعہ "دھرتی کے گیت" کے نام سے پربھات پبلشرز، الہ آباد سے شائع ہونا تھا، بعد میں نام تبدیل کر دیا گیا۔

۴۔ "موج مری صرف صدف" دیباچہ بعنوان: "مجھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں" از مصطفےٰ زیدی
مطبوعہ: لاہور اکیڈمی، لاہور پاکستان) طبع اول: فروری ۱۹۶۰ء
ماورا پبلشرز راولپنڈی / لاہور (پاکستان)

۵۔ "گریبان" مطبوعہ: مکتبہ ادب جدید، لاہور (پاکستان) طبع اول: ۱۹۹۳ء

ماورا پبلشرز راولپنڈی / لاہور (پاکستان)

۶۔ "قبائے ساز" جوش اکیڈمی کراچی (پاکستان) طبع اول: ۱۹۶۷ء

ماورا پبلشرز راولپنڈی / لاہور (پاکستان)

۷۔ "کوہ ندا" ابتدائیہ بعنوان: "مصطفیٰ زیدی: ایک تعارف" (ادارہ)

"حرف آخر" از مصطفیٰ زیدی

"شام غزل" از مصطفیٰ زیدی

مطبوعہ: کتب پرنٹرز پبلیشرز لمیٹڈ، کراچی (پاکستان) طبع اول: ۱۹۷۱ء

ماورا پبلشرز، راولپنڈی / لاہور (پاکستان) طبع دوم: ستمبر ۱۹۷۵ء

سرورق: مصطفیٰ زیدی

۸۔ "کلیات مصطفیٰ زیدی" اس میں اولین مجموعہ "زنجیریں" شامل نہیں ہے۔ نامکمل کلیات ،

مطبوعہ: ماورا پبلشرز۔ ۳ بہلول پور روڈ، لاہور (پاکستان)

مطبوعہ نثر:

۱۔ "سالگرہ" (کتابچہ) مینا کماری ناز کے قلمی نام سے۔ کل صفحات ۳۵

دبیز آرٹ پیپر پر خوبصورت ٹائپ میں چکنے کاغذ کے رنگین سرورق کے ساتھ، جس پر پاکستان کی نمایاں فلمی اداکاراؤں کی تصاویر تھیں۔ اس کا مواد چند اعلیٰ افسروں اور ان پری وشوں کے شب باشی کے قصے اور وہی وہانوی کا انداز تحریر۔

مطبوعہ: نام مطبع و سنہ اشاعت ندارد (کتابچہ لاہور سے شائع ہوا)

۲۔ پمفلٹ، بابت: شہناز گل

اس پمفلٹ میں شہناز گل کی دو عریاں تصاویر اور اس کے خاوند سلیم خان کے علاوہ چند دیگر افراد' جن میں سیٹھ پیربھائی بھی شامل ہے کے متعلق فحش تحریری مواد شامل تھا۔ یہ پمفلٹ کراچی سے تقریباً چار ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔

(بحوالہ : ۵ ر نومبر ۱۹۷۰ء ــــ ڈرگ روڈ تھانے میں لکھوائی گئی ابتدائی رپورٹ)

ترتیب و تہذیب :

۱۔ ماہنامہ "نکہت" الہ آباد (بھارت) : شریک مدیر مصطفےٰ زیدی' سال ۱۹۴۸ء

۲۔ ماہنامہ "کرن" الہ آباد (بھارت) : مدیر مصطفےٰ زیدی' سال ۱۹۴۸ء

۳۔ مجلہ دو ماہی "شب تاب" جہلم : نگران : مصطفےٰ زیدی

کیپٹن محمد ایوب پرنٹر پبلشر نے تعمیر جنگ پریس' راولپنڈی سے چھپوا کر دفتر رائٹرز گلڈ' جہلم سے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔

۴۔ مجلہ "فردا" منٹگمری' نگران : مصطفےٰ زیدی

یہ ڈسٹرکٹ کونسل منٹگمری (حال ساہیوال) کے ہفت روزہ خبرنامے "منٹگمری گزٹ" کا ادبی ایڈیشن تھا۔ اس پرچے کے دو شمارے مولانا صلاح الدین احمد نمبر اور اشاعت خاص سال ۱۹۶۳ء مصطفےٰ زیدی کے مرتب کردہ تھے۔

ڈائریاں مرتبہ: مصطفےٰ زیدی

۱۔ ایک ڈائری جس میں ہر سادہ صفحے کے ساتھ مصطفےٰ زیدی کی اتاری ہوئی ایک ایک تصویر شامل تھی۔ اس ڈائری پر طباعت کی تاریخ درج نہیں۔

۲۔ ۱۹۶۸ء میں عید کے موقع پر سنہری حاشیے کے ساتھ کشتئی رنگ کی پاکٹ سائز ڈائری' جس کے ایک طرف مصطفےٰ زیدی کی اپنی تصویر اور مندرجہ ذیل اشعار چھپے

ہوئے تھے:

دن کی اک اک بوند گراں ہے

اک اک جرعۂ شب نایاب

شام و سحر کے پیمانے میں

جو کچھ ہے ڈر کے بیچ

شاعری (غیر مدون)

۱۔ کربلا اے کربلا (مرثیہ)

مصطفےٰ زیدی کے چھوٹے بھائی ارتضیٰ زیدی کے مطابق مصطفےٰ زیدی نے اس مرثیہ کے ۱۵۰ بند لکھ لئے تھے' جن میں سے صرف ۳۹ بند ایک ڈائری سے دستیاب ہو سکے۔ ارتضیٰ زیدی نے اس نامکمل مرثے کو "نوائے وقت" لاہور میں شائع کروا دیا ہے۔ یاد رہے کہ اس مرثیہ کے چند بند "کوہ ندا" میں شامل کر دیے گئے تھے۔

۲۔ اسلامیہ کالج کے مرحوم پرنسپل اے۔ام۔ مولوی سے متعلق ہجویہ نظم۔

۳۔ ادا جعفری سے متعلق ۱۷ اشعار کی ہجویہ نظم' جس کا پہلا شعر ہے:

تمہی کہو کہ ادا جعفری کے پاس کہاں

ہمارا طرزِ تکلم ہمارا طرزِ بیاں

اس ہجویہ نظم کے اکثر اشعار فحش ہیں۔

۴۔ بڑے بھائی احمد رضا کے خلاف نظم' جس کا ایک شعر ہے:

حضرتِ احمد رضا کو کوئی سمجھا دے یہ بات

مادہ الٹے گا اک دن روح کا کل کائنات

۵۔ مصطفےٰ زیدی کی فحش گوئی سے متعلق سینکڑوں اشعار اور کئی نظمیں۔ جن سے

متعلق مصطفےٰ زیدی "موج مری صدف صدف" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"بیشتر ایسے اشعار ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتے ہیں اور کبھی نہیں چھپ سکتے"

۶۔ فراق گورکھپوری کے رنگ میں لکھی گئی رباعیات مطبوعہ: یوئنگ کرسچین کالج میگزین الہ آباد۔

۷۔ ابو الکلام آزاد کے خلاف ایک نظم۔ جس میں آزاد کی ۱۹۴۸ء کے الیکشن سے متعلق ایک تقریر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نظم کا ایک مصرع ہے:

حافظ کے شعر چھوڑ کے دوہوں پہ آ گئے

مضامین (غیر مدون)

۱۔ "ادبی ذوق کا سوال" مشمولہ: نقش، کراچی، زیدی نمبر شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء

۲۔ "تنقید پر تنقید" مشمولہ: نقش، کراچی، زیدی نمبر شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء

۳۔ "شبیر حسن خان" (جوش ملیح آبادی کی شخصیت) ایضاً

۴۔ "جوش اور ان کا فن"

۵۔ "اے غائب از نظر" (مولانا صلاح الدین احمد کے آخری سفر کی روداد)

۶۔ "مجاز تورا، عظیم امیر بھائی اور میں" (مجاز لکھنوی سے متعلق۔ اور دیگر یاداشتیں) یہ مضمون پہلے انگریزی اور اس کے بعد افکار کراچی کے مجاز لکھنوی نمبر کے لئے اردو میں لکھا گیا ہے۔

۷۔ پشاور ریڈیو کے لئے لکھے گئے مضامین کی ایک معقول تعداد اس کے علاوہ ہے۔

۸۔ دوستوں کے نام لکھے گئے سیکڑوں خطوط۔

ترتیب و انتخاب (غیر مطبوعہ)

۱۔ کلیات نظیر اکبر آبادی:

مصطفٰے زیدی نے نظیر اکبر آبادی کی کلیات مرتب کی تو آسی کے چھوڑے ہوئے DOTS کے علاوہ سینکڑوں نادر ونایاب اشعار شامل کر دیئے۔ زیدی نے یہ کام میری لائبریری' لاہور کے لئے کیا تھا' جو تاحال شائع نہیں ہو سکا۔

۲۔ انتخاب نظیر:

مصطفٰے زیدی نے یہ کام بھی میری لائبریری' لاہور کے لئے کیا تھا۔

۳۔ مجلّہ دو ماہی "شب تاب" "جہلم کا ممنوعہ ادب نمبر" جس میں قرآن حکیم اور بائبل کو شامل کرنے کا ارادہ تھا۔ یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

مصطفٰے زیدی سے متعلق تحقیقی کام۔

برائے ایم اے (اردو)

۱۔ "مصطفٰے زیدی: "شخصیت اور فن" از مرزا حامد بیگ (نگران: پروفیسر سجاد باقر رضوی)

مقالہ برائے ایم اے (اردو) پنجاب یونیورسٹی اورنیٹل کالج لاہور ۱۹۷۱ء

۲ "مصطفٰے زیدی: شخصیت اور شاعری" از ظفر اللہ خان (نگران: ڈاکٹر محمد یونس حسنی)

مقالہ برائے ایم۔اے (اردو) کراچی یونیورسٹی' کراچی ۱۹۸۳ء

مطبوعہ: مجلس فکر و ادب' ۱۷ شاہراہ فیصل 'کینٹ بازار' کراچی طبع اول ۱۹۸۴ء

مقدمہ: حرف چند' از ڈاکٹر یونس حسنی۔

گرد پوش پر ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی آراء

مصطفےٰ زیدی سے متعلق مستقل تنقیدی کتب۔

۱۔ "الرحوم" مرتبہ اشرف قدسی' مطبوعہ: لاہور ۱۹۷۰ء

۲۔ مصطفےٰ زیدی: شخصیت اور شاعری' از ظفراللہ خان' مطبوعہ: مجلس فکر و ادب' کراچی طبع اول ۱۹۸۳ء

مصطفےٰ زیدی کے متعلق ادبی رسائل کے ایڈیشن:

۱۔ افکار' کراچی' زیدی ایڈیشن' مرتبہ صہبا لکھنوی' طبع اول: اکتوبر ۱۹۷۰ء

طبع دوم: دسمبر ۱۹۷۰ء

مشمولات طبع دوم:

تاثرات : جوش ملیح آبادی' فیض احمد فیض' ڈاکٹر عبادت بریلوی' سید ہاشم رضا' عبدالرحمن چغتائی اور نیاز میر

غیر مطبوعہ یادگار خطوط:

مصطفےٰ زیدی بنام صہبا لکھنوی' مسعود اشعر' قمر ہاشمی' محسن بھوپالی' ضمیر ترابی اور ابن انشاء

۲۰ یادگار تصاویر۔

غیر مطبوعہ کلام' نیز عکسی تخلیقات

مضامین:

از فراق گورکھپوری (پیش لفظ: "زنجیریں" ' مطبوعہ ۱۹۴۷ء) احمد ندیم قاسمی (زیدی کا فن) محمد علی صدیقی (ایک زندہ شاعر) سبط حسن (شاعر محفل وفا) سحر انصاری (جو سنا افسانہ تھا)

سید رضا کاظمی (مصطفٰے کہ جو تھا) مسعود اشعر (انبوہ کی تنہائی کا المیہ) احمد علی سید (مصطفٰے زیدی کچھ یادیں کچھ باتیں) لطیف کاشمیری (زیدی ایک کھلی کتاب) محسن بھوپالی (مصطفٰے زیدی کا جہلم)

حرفِ عقیدت (شعراء کے نذرانے)

رئیس امروہوی، قتیل شفائی، قمر ہاشمی، شبنم رومانی، ساقی جاوید، سحر انصاری، محسن اکبر کمال، سعید گیلانی، طالب قریشی، صہبا لکھنوی، محشر بدایونی، انور حارث اور نور الزماں اوج انتخاب کلام نیز: مصطفٰی زیدی کے دو مضامین بعنوان: "مجاز، نورا، شمیم، امیر بھائی اور میں" "اپنا دیواں بغل میں داب کے میر"

افکار کراچی۔ زیدی ایڈیشن کی طبع دوم میں احمد ندیم قاسمی، ابن انشاء، محمد علی صدیقی، مسعود اشعر، احمد علی سید، رضا کاظمی اور لطیف کاشمیری کے مضامین اور ویرا زیدی (بیگم مصطفٰے زیدی) کا انٹرویو بطور خاص اضافہ ہیں۔ اس ایڈیشن میں نئی نیز غیر مطبوعہ نظمیں شامل اشاعت ہیں۔

۲۔ نقش، کراچی "مصطفٰے زیدی نمبر" مرتبہ شمس زبیری، طبع اول: مارچ اپریل ۱۹۷۱ء

مشمولات:

"سخن ہائے گفتنی" از شمس زبیری (مدیر)

مصطفٰے زیدی کی ۳۵ نادر تصاویر

غیر مطبوعہ یادگار خطوط: جوش ملیح آبادی بنام مصطفٰے زیدی

مصطفٰے زیدی بنام جوش (۳ خطوط) والدہ محترمہ، ارتضیٰ زیدی (بھائی)، ویرا میری (بیگم) عصمت (بیٹی) مجتبیٰ زیدی (بیٹا) انتظار حسین،

شاہد عشق' اختر انصاری اکبر آبادی اور واصل عثمانی

نقوش اسناد (اہلیت اسناد کی روشنی میں)

مضامین:

جوش ملیح آبادی (ہائے زیدی) ممتاز حسین (مصطفیٰ زیدی مرحوم)

ویرا زیدی (اخباری بیان) ارتضیٰ زیدی (میرا بھائی) میرزا ادیب (ایک شخص) ڈاکٹر سید محمد عقیل (تیغ الہ آبادی) محمد طفیل (زیدی صاحب) ڈاکٹر فرمان فتح پوری (دو ملاقاتیں) ابن صفی (میرے بچپن کا ساتھی) شاہد عشق (خواب تھا کہ جو کچھ دیکھا) مسعود اشعر (ایک تھا راجہ) انور سدید (مصطفیٰ زیدی کا عشق) واصل عثمانی (تیغ الہ آبادی سے مصطفیٰ زیدی تک) افتخار ساجد (جانے والا)

فن سے متعلق مضامین:

ڈاکٹر احسن فاروقی (ایک ذہین انسان ایک بڑا شاعر) احسان دانش (ایک دعا جو قبول نہ ہو سکی) ڈاکٹر محمد باقر (مصطفیٰ زیدی) احمد ندیم قاسمی (مصطفیٰ زیدی کا فن) سجاد باقر رضوی (قطرے سے گہر ہونے تک) نظیر صدیقی (مصطفیٰ زیدی کی شاعری)

تعزیت مہر و وفا (شعراء کے نذرانے)

رباعیات' جوش ملیح آبادی "زیدی مرحوم" شاعر لکھنوی' "بازیچہ اطفال" اختر انصاری اکبر آبادی "مصطفیٰ زیدی" ناصر شہزاد "مصطفیٰ زیدی" "ربیعہ فخری" "مصطفیٰ زیدی" ہدایت اللہ اختر "مصطفیٰ زیدی" واصل عثمانی

مصطفیٰ زیدی کی نثر

"شبیر حسن خان" از مصطفیٰ زیدی "مجاز' نورا' شمیم' امیر بھائی اور میں" از مصطفیٰ زیدی "ادبی ذوق کا سوال" از مصطفیٰ زیدی "تنقید پر تنقید" از مصطفیٰ زیدی

مصطفےٰ زیدی کی شاعری سے انتخاب

مصطفےٰ زیدی کے چھ مطبوعہ شعری مجموعوں کے تعارف نیز مشمولات سے انتخاب

○

مصطفےٰ زیدی سے متعلق مطبوعہ مضامین (غیر مدون)

۱۔ "تیغ الہ آبادی کا ایک مختصر تعارف" از محمود سلیم جیلانی' مطبوعہ راوی (خاص نمبر) گورنمنٹ کالج لاہور۔ ۱۹۵۲ء

۲۔ میری پتھر آنکھیں' مسافر' دست تام' کوہ ندا اور سپردگی کا عالم ـــــ نظموں پہ ایک تاثر از جیلانی کامران مطبوعہ : نقوش لاہور اگست ۱۹۶۹ء

۳۔ "مصطفےٰ زیدی کی شاعری پر ایک تاثر" از مجید امجد مشمولہ : "المرحوم" مرتبہ اشرف قدسی مطبوعہ: لاہور ۱۹۷۰ء

۴۔ "قطرے سے گہر ہونے تک" از سجاد باقر رضوی' مطبوعہ: "نئی قدریں" حیدر آباد' جدید شاعری نمبر۔

۵۔ "مصطفےٰ زیدی کی شاعری" از نظیر صدیقی' مطبوعہ: "اردو" کراچی جلد ۴۶ شمارہ ۳۔۴' ۱۹۷۰ء

۶۔ قبائے ساز (تبصرہ) از وقار عظیم' مطبوعہ: فنون' لاہور سالنامہ ۱۹۶۸ء

۷۔ مصطفےٰ زیدی کی غزل' از حسن سجاد حیدر' مطبوعہ: نئی قدریں حیدر آباد۔ سندھ ۱۹۷۱ء

۸۔ مصطفےٰ زیدی' از کرنل اطہر' مطبوعہ: سیارہ ڈائجسٹ' لاہور اکتوبر ۱۹۷۵ء

۹۔ اب میرے قاتل کو چاہو' از مرزا حامد بیگ' مطبوعہ: خیابان راولپنڈی شمارہ نمبر ۱

۱۰۔ کہیں تو مل مجھے اے گمشدہ خدا میرے' از مرزا حامد بیگ' مطبوعہ : اظہار'

کراچی "جریدہ" پشاور

۱۔ سید مصطفےٰ زیدی : نئے انکشافات' از بیدار سرمدی' مطبوعہ : نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء

مصطفےٰ زیدی سے متعلق غیر مطبوعہ تحریریں (غیر مدون)

۱۔ قبائے ساز' از ڈاکٹر میمونہ انصاری ۔۔۔ یہ مضمون' بزم کتاب' لاہور کی ایک تقریب جس کی صدارت فیض احمد فیض نے ۲۸ ستمبر ۱۹۶۷ء کی شام کی تھی' میں پڑھا گیا۔

دیگر حوالے:

۱۔ لخت حسنین زیدی اور محمد علی جوہر سے متعلق حوالہ : نگار' نئی دہلی اکتوبر ۱۹۷۹ء

۲۔ مصطفےٰ زیدی کا خط بنام ابن انشاء مطبوعہ : سوغات' کراچی' جدید شاعری نمبر

۳۔ بیان : شہناز گل' مطبوعہ : روزنامہ جنگ' کراچی ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء

۴۔ خبر : روزنامہ مشرق' لاہور ۱۵ نومبر ۱۹۷۰ء

۵۔ خبر : روزنامہ مشرق' لاہور ۳ فروری ۱۹۷۲ء

۶۔ خبر : روزنامہ مشرق' لاہور ۱۷ ستمبر ۱۹۷۱ء

۷۔ اشتہار : بابت مصطفےٰ زیدی کے تیسرے شعری مجموعے بنام : "دھرتی کے گیت" مطبوعہ : رسالہ آنچل' الہ آباد ۔۔۔ اشتہار کے مطابق مصطفےٰ زیدی کا یہ مجموعہ پربھارت پبلشرز چوک الہ آباد (بھارت) سے شائع ہونا تھا۔

۸۔ مصطفٰے زیدی (فتح الہ آبادی) کے خلاف لکھی گئی ایک نظم بعنوان: "شیطان پیدا ہو گیا ہے"۔ ۱۹۸۳ء میں یہ نظم الہ آباد کے چند شعراء نے مل کر لکھی تھی جو سینہ در سینہ ہم تک پہنچی ہے۔

۹۔ نئے الو کے موڑ بدلنے والا' از شمس الرحمٰن فاروقی' مطبوعہ: جواز' مالی گاؤں بھارت شمارہ نمبر ۱۸ بابت جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء اس مضمون کا ایک حصہ مصطفٰے زیدی سے متعلق ہے۔

مُصطفیٰ زیدی کی کہانی

مرزا حامد بیگ